ماہنامہ

میثاق

لاہور

اکتوبر ۱۹۸۰

اشاعت خصوصی مشتمل بر مقالات ساتویں سالانہ

قرآن کانفرنس

منعقدہ (۱۸ تا ۲۱ اپریل ۱۹۸۰) لاہور

زیر اہتمام

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

صدر محترم

ڈاکٹر اسرار احمد

اس شمارے کی قیمت ——— ۵/- روپے

جلد ۲۹ | ماہ ستمبر - اکتوبر ۱۹۸۰ء | شمارہ نمبر ۹-۱۰

مشمولات

★ عرض احوال ... ... ادارہ ۱
★ روشنیوں کا سفر ... ... ادارہ ۳
★ اسلامی نظام معیشت ... ... ڈاکٹر اسرار احمد ... ۱۳

مقالات قرآن کانفرنس

★ قرآن کا دستور اساسی ... ... علامہ محمد تقی امینی ... ۳۱
★ قرآن حکیم اور محروم طبقات ... مولانا محمد حسین میر ... ۴۸
★ قرآن مجید - ایک نسخۂ کیمیا ... پروفیسر اختر الواسع ... ۷۱
★ قرآنی تعلیمات اور ہم ... ... خواجہ غلام صادق ... ۷۹
★ درس قرآن اور تعمیر حیات ... ڈاکٹر عبدالرؤف ... ۸۵
★ عظمت قرآن بزبان رسول ... سید حامد میاں ... ۸۹
★ سنت رسول کی اہمیت ... ڈاکٹر الطاف جاوید ... ۹۹
★ بھکتی تحریک ... ... پروفیسر یوسف سلیم چشتی ۱۱۸
★ اسلام کا روحانی نظام ... جناب خلیق احمد ... ۱۳۱
★ اقبال کا پیغام ۱۳۸
★ سائنس بطور تصوف ... ... مظفر حسین ... ۱۴۴

پبلشر ڈاکٹر اسرار احمد ★ طابع : رشید احمد چوہدری
مطبع جدید پریس ' شارع فاطمہ جناح ' لاہور

ادارہ

عرضِ احوال

"میثاق" کا یہ شمارہ ایسے وقت میں شائع ہو رہا ہے کہ چودھویں صدی بس چند دنوں کی مہمان ہے۔ اور پندرھویں صدی کا آغاز ہوا چاہتا ہے۔ ہماری اگلی ملاقات انشاء اللہ نئی صدی کے آغاز پر ہوگی۔

اس صدی میں دنیائے عالم اسلام کا بدترین زوال دیکھا اور پھر خوشگوار بیداری بھی۔ اس بیداری کے نتیجے میں مسلم ممالک ذہنی طور پر نہ بھی جغرافیائی آزادی کی نعمت سے بہرہ ور ہوئے اور پھر اسی صدی کے اواخر میں عالم اسلام کے اتحاد اور بہت سے مسلم ممالک میں اسلامی نظام کے نفاذ کا غلغلہ بلند ہوا۔ یہ کہنا تو شاید مبالغہ ہو کہ عالم اسلام میں نفاذ اسلام کی تحریک کامیابی سے ہمکنار ہو رہی ہے۔ لیکن اس سے بھی انکار ممکن نہیں کہ اب کسی مسلم ریاست میں بھی اسلام کا نام لیئے بغیر نظام حکومت چلانا آسان نہیں رہا۔

ایک طرف جہاں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لئے ایک عزم، اور تڑپ اور جذبہ حوصلہ افزا ہے۔ وہاں دشمن بھی پوری ہوشیاری اور تیاری کے ساتھ مقابلے کے لئے خم ٹھونک رہا ہے۔ البتہ یہ امر انتہائی افسوسناک ہے کہ جس قدر زبانی کلامی باتیں ہو رہی ہیں اور جس نے دشمن کو آنکھیں کھلی رکھنے پر مجبور کر دیا ہے عملی اقدامات کے سلسلے میں اسی قدر غفلت شعاری اور سست رفتاری پائی جاتی ہے چنانچہ اسلام دشمن قوتیں جس رفتار سے اپنی کاروائیوں میں مصروف ہیں۔ اگر ہمارے لیل و نہار یہی رہے تو خطرہ ہے کہ ہم پھر کسی ناگہانی آفت کا شکار نہ ہو جائیں۔ ایک طرف اتحاد کی باتیں اور دوسری طرف ایک دوسرے کے خلاف مسلم ممالک کی محاذ آرائی جن خطرات کو دعوت دے رہی ہے اس سے آنکھیں بند کرنا

ممکن نہیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ مسلم ممالک اتحاد کے مسئلے پر مسلم حکومتیں اسلامی ضابطۂ حیات کے نفاذ کے سلسلے میں اور مسلم عوام اسلامی زندگی گذارنے کے لئے اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرتے ہوئے اپنے عمل سے اپنے دعوؤں کا ثبوت پیش کریں۔

"میثاق" کا پچھلا شمارہ اگست کے تیسرے ہفتے کے دوران شائع ہوا تھا خدشہ تھا کہ ستمبر، اکتوبر کی مشترکہ ضخیم اشاعت جو ساتویں قرآن کانفرنس کے مقالات پر مشتمل ہے سابقہ معمول کے مطابق کہیں جا کر اکتوبر کے اواخر تک پیش کی جا سکیگی۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ ہم اسے ستمبر میں مکمل کر رہے ہیں۔

اب بھی اگر "میثاق" آپ کے پاس تاخیر سے پہنچتا ہے تو اس کی وجہ طباعت، جلد بندی اور ترسیل کے مراحل ہیں جہاں تاخیر کو تعجیل میں بدلنا ہمارے بس میں نہیں۔ البتہ ہماری کوشش ہوگی کہ ان شاء اللہ آئندہ سے "میثاق" بغیر کسی تاخیر کے ماہ بماہ قارئین تک پہنچتا رہے۔ اس شمارے میں یوں تو ہر مقالہ اپنے موضوع کا حق ادا کر رہا ہے۔ لیکن جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی ایک تقریر "اسلامی نظام معیشت ۔ چند اہم نکات" خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔

حقیقت بھی یہی ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ گہرے غور و فکر کے متقاضی ہیں ضرورت اس امر کی ہے کہ ان نکات کو رہنما اصولوں کی حیثیت دیکر نیا معاشی نظام ترتیب دیا جائے یہی ہمارے معاشی اور اقتصادی مسائل کا حل ہے۔ ہماری خواہش تھی کہ ڈاکٹر صاحب اس پر نظر ثانی فرماتے لیکن عدیم الفرصتی کے باعث وہ ایسا نہ کر سکے۔ اور مزید تاخیر ہم نے مناسب نہ سمجھی اس لئے اس مضمون کے سلسلے میں کوئی تشنگی محسوس ہو تو یہ ایک فطری بات ہوگی۔

ڈاکٹر صاحب غیر ملکی تبلیغی دورے کے سلسلے میں اب امریکہ میں ہیں جہاں وہ دعوت رجوع الی القرآن پیش کر رہے ہیں اب تک کے پروگرامول کے سلسلے میں جو اطلاعات یہاں موصول ہوئی ہیں اُن کے مطابق ڈاکٹر صاحب کا دورۂ کینیڈا انتہائی کامیاب رہا ہے جس کے بعد توقع ہے کہ ان شاء اللہ ان کا دورۂ امریکہ بھی نوید کامیابی لائے گا۔ اور وطن واپسی کے بعد ڈاکٹر صاحب کے

دورۂ کنیڈا، امریکہ و برطانیہ کی رپورٹ پیش کی جائے گی۔ مغرب میں اس وقت رُوحانی تشنگی پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے وہاں قرآنی تعلیمات کی ترویج واشاعت کا ایک وسیع میدان موجود ہے۔ ہماری دعا ہے کہ نہ صرف وہاں موجود مسلمان ڈاکٹر صاحب کے قرآنی اور رُوحانی پیغام سے مستفید ہوں، بلکہ اللہ کرے کہ مغرب کی تلاشِ حقیقت میں سرگرداں نژادِ نو بھی قرآن آشنا ہو۔ جو ان کی بے قراریوں کا اصل علاج ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحی
کی شاہکار تصانیف

حقیقتِ دینؔ
اور
مبادیِ تدبرِ قرآن

کے نئے ایڈیشن شائع ہو گئے ہیں
خوبصورت کتابت، دیدہ زیب طباعت اور عمدہ کاغذ

قیمت

حقیقتِ دین ——— -/۲۴ روپے
مبادیِ تدبرِ قرآن ——— -/۱۶ روپے
علاوہ محصولِ ڈاک

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور (رجسٹرڈ)

پہلی قرآن کانفرنس سے ساتویں قرآن کانفرنس تک

روشنیوں کا سفر

آج سے آٹھ سال قبل قرآن مجید کی تعلیم و تفہیم کے لئے مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کا قیام عمل میں لایا گیا تھا تب یہ ایک ناتواں پودا تھا۔ جسے مخالفتوں کے جھکڑ اور رکاوٹوں کی آندھیاں جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لئے بیتاب تھیں مگر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور مالی کی پُرخلوص محنت کے طفیل اس مادہ پرستانہ ماحول کے صحرا میں وہ شجر سایہ دار بن چکا ہے۔

انجمن کو یہ فخر حاصل ہے کہ اُس نے اپنے موسس جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی زیر سرپرستی ملک میں قرآن کانفرسوں کی طرح ڈالی اور اب تک اعلیٰ سطح کی سات قرآن کانفرنسیں منعقد ہو چکی ہیں۔ یوں تو ہر سال منعقد ہونے والی قرآن کانفرنس کی کاروائی ملکی اخبارات و جرائد اور "میثاق" کے ذریعے قارئین تک پہنچتی رہی ہے۔ مگر کچھ لوگ ابتدا میں رجوع الی القرآن کی اس تحریک سے باخبر نہیں ہو سکے اور کہیں بعد میں جا کر انہیں اس شجر سایہ دار کے ٹھنڈے سائے میں دو گھڑی بیٹھنے کا اتفاق ہوا ہے وہ پہلی قرآن کانفرنس اور پھر بڑھتے قدموں، گھٹتی مسافتوں کی مسلسل داستان آویزۂ گوش نہیں کر پائے۔ اس لئے سات برسوں پر پھیلی یہ داستان اختصار کے ساتھ پھر پیش خدمت ہے۔

پہلی قرآن کانفرنس کا انعقاد ۱۴ دسمبر ۱۹۷۳ء کو ٹاؤن ہال (اب جناح ہال) لاہور میں ہوا۔ ہنگامہ پسندی کے اُس دور میں خالص قرآن حکیم کے موضوع پر کانفرنس کا انعقاد

دلیسپی بھی لوگوں کے لئے حیران کن تھا اس پر مزید مسرت آمیز تحیّر کا اضافہ ذوق وشوق اور نظم وضبط کے مظاہرے سے ہوا اور سب سے بڑھ کر حیرت افزا بات لوگوں کو یہ محسوس ہوئی کہ اختلاف اور افتراق وانتشار کی اس صدی میں تقریباً تمام مکاتبِ فکر کے اہل علم وفضل حضرات نے اس کانفرنس میں شرکت کی۔

پہلا اجلاس جمعہ ۱۴ دسمبر صبح ۹ بجے سے ۱۲ بجے تک جاری رہا جس کا موضوع عظمتِ قرآن تھا۔ صدارت مولانا عبیداللہ انور نے کی اور مہمان خصوصی حضرت مولانا محمد یوسف بنوری مرحوم تھے اس نشست کے مقررین تھے صاحبزادہ مولانا عبدالرحمان (جامعہ اشرفیہ) مولانا محمد اجمل، پروفیسر شکور حسین یاد پروفیسر محمد منور مرزا، مولانا الٰہی بخش جاراللہ، ڈاکٹر برہان احمد فاروقی اس اجلاس کی ایک تقریر تو ایسی تھی۔ جسے شائد ہی سامعین بھلا سکے ہوں، جناب مولانا متین ہاشمی نے سقوط مشرقی پاکستان کا ذکر چھیڑ دیا اور پوری محفل اشکبار ہو گئی۔ نماز جمعہ سے قبل مولانا محمد یوسف بنوری مرحوم نے جامع مسجد خضرا، سمن آباد میں "عظمت قرآن" کے موضوع پر خطاب فرمایا۔ اس لحاظ سے یہ نشست ۱۲ بجے کے بجائے نماز جمعہ تک جاری رہی۔

کانفرنس کی دوسری نشست جناب مولانا محمد یوسف بنوری کی صدارت میں بعد نماز مغرب شروع ہو کر رات گئے جاری رہی۔ اس نشست سے مولانا مفتی محمد حسین نعیمی، ملک محمد اسلم، عبدالرشید نعمانی، اور جناب ریاض احمد فریدی نے خطاب کیا۔ موضوع تھا "قرآن اور سنت کا باہمی ربط وتعلق"۔

ہفتہ ۱۵ دسمبر کو صبح نو بجے، تیسری نشست کا آغاز ہوا جس کی صدارت پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے کی۔ چونکہ اس اجلاس کا موضوع "قرآن حکیم اور علامہ اقبال رح" تھا اس لئے پہلے مقرر مشہور ماہر اقبالیات جناب سید نذیر نیازی تھے بعد میں جناب مظفر حسین، ڈاکٹر ابصار احمد، پروفیسر محمد منور مرزا اور صدر اجلاس نے خطاب کیا۔ چوتھی نشست اسی شام "قرآن مجید اور دورِ علم جدید" کے موضوع پر علامہ علاؤ الدین صدیقی (مرحوم) کی زیر صدارت منعقد ہوئی اور جناب محمد حنیف ندوی، ڈاکٹر امان اللہ خان، ڈاکٹر عبدالبصیر پال نے مقالات پڑھے۔ ڈاکٹر

محمد عالمگیر خان نے "اسلام اور جدید طب" پر مقالہ پیش فرمایا۔

ان دنوں لاہور میں اسلامی سربراہی کانفرنس کے انعقاد کی تیاریاں زوروں پر تھیں اور اسمبلی ہال میں کانفرنس کے انعقاد کے انتظامات کیے جا رہے تھے۔ اس لئے صوبائی اسمبلی کے اجلاس کے لئے حکومت نے ٹاؤن ہال کا انتخاب کیا۔ چنانچہ ٹاؤن ہال کے منتظمین نے اسے اسمبلی ہال کے طور پر استعمال میں لانے کی غرض سے قرآن کانفرنس کی آخری نشست کے انعقاد سے معذرت کر لی۔ لہٰذا یہ نشست مسجد شہداء میں منعقد ہوئی۔ آخری نشست کے صدر مولانا امین احسن اصلاحی تھے اور موضوع تھا "تدبر قرآن اور مولانا حمید الدین فراہی"۔ جناب محمد نصیب خالد مسعود، محمود احمد لودھی، نے مقالات پڑھے۔ جناب مولانا عبدالرحیم اشرف نے "اسلام کی نشاۃ ثانیہ اور قرآن حکیم" کے موضوع پر تقریر فرمائی اور مولانا امین احسن اصلاحی کا صدارتی خطبہ ہوا۔

پہلی کانفرنس کی کامیابی سے انجمن خدام القرآن کے منتظمین کے حوصلے بلند ہو گئے اور وہ ہر سال اس طرح کی کانفرنس منعقد کرنے سے متعلق سوچنے لگے دراصل پہلا قدم ہی آگے بڑھنے یا رک جانے کا فیصلہ کرنے میں ممد ثابت ہوتا ہے۔ پہلا قدم پیام کامرانی لایا تو یہ قدم بڑھنے لگے اور ہر قدم کامرانیوں کی داستاں بن گیا۔

دوسری قرآن کانفرنس

۲۴، ۲۵، مارچ ۱۹۷۵ء کو دوسری سالانہ قرآن کانفرنس بھی ٹاؤن ہال لاہور میں منعقد ہوئی۔

پہلے اجلاس کی صدارت جامعہ اشرفیہ کے شیخ الحدیث مولانا محمد مالک کاندھلوی نے فرمائی اور اس میں درج ذیل مقالات پڑھے گئے۔

۱۔ حفاظت متن قرآن۔ حافظ احمد یار صاحب
۲۔ قرآن حکیم اور معاشرتی بہبود۔ ڈاکٹر امان اللہ صاحب
۳۔ نشر و اشاعت قرآن کا ایک منصوبہ۔ محمود احمد غفاری صاحب

دوسری نشست کی صدارت مولانا مفتی محمد حسین نعیمی نے فرمائی۔

مولانا سید حامد میاں کا مقالہ "قرآن و سنت اور تواتر و تعامل" پر پیش ہوا، اور پروفیسر سید ابوبکر غزنوی نے "بارگاہِ رسالت سے ہمارے تعلق کی بنیادیں" اور مولانا عبدالرحمٰن نے "قرآن اور سنت رسول" کے موضوع پر مقالات پڑھے۔

تیسرے اجلاس کی صدارت جناب ڈاکٹر سلیم فارانی نے کی جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب، پروفیسر محمد منور مرزا، چوہدری منظر حسین، پروفیسر مشکور حسین یاد، پروفیسر سید نذیر نیازی نے "اقبال، پاکستان اور اسلام" کے حوالے سے گفتگو کی۔

چوتھی نشست ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کی صدارت میں ہوئی جس میں جناب عبدالبصیر پال نے قرآن حکیم اور فکر جدید، ڈاکٹر ابوبکر نے مسئلہ ارتقاء اور قرآن حکیم اور ڈاکٹر صادق حسین نے علم الجنین اور قرآن حکیم کے موضوعات پر مقالے پیش فرمائے۔

پانچواں اجلاس صبح ۸½ بجے شروع ہوا یہ بارہ ربیع الاوّل کا دن تھا اس لئے اجلاس کا موضوع "قرآن مجید اور بعثت رسول" تھا۔ اس اجلاس کی واحد تقریر مرکزی انجمن خدام القرآن کے سربراہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی تھی اور صدارت کی کرسی پر رونق افروز تھے ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی اسلام آباد کے ڈائریکٹر جناب ڈاکٹر عبدالواحد ہالے پوتا۔

بعد نماز عصر اس کانفرنس کی آخری نشست ہوئی۔ جناب یوسف سلیم چشتی اور مولانا امین احسن اصلاحی اس نشست کے مقررین تھے اور اس طرح سے یہ دوسری کانفرنس تیسری کانفرنس کے لئے مہمیز ثابت ہوئی۔

تیسری قرآن کانفرنس

بھی لاہور کے ٹاؤن ہال ہی میں منعقد ہوئی یہ کانفرنس ۲۱ مارچ کو شروع ہوئی اور ۲۳ مارچ ۱۹۷۶ء کو بخیر و خوبی اختتام کو پہنچی کانفرنس کی پہلی نشست محفل حسن قرأت کے لئے مخصوص تھی۔ جس میں: (۱) قاری محمد شاکر انور (۲) قاری احمد میاں تھانوی (۳) قاری عاکف سعید (۴) قاری محمد آصف (۵) قاری مرتضیٰ حسین

(۶) قاری عبدالواحد (۷) قاری عبدالقیوم (۸) قاری رحیم بخش اور صدر محفل قاری حسن شاہ صاحب شریک ہوئے۔ محفل قرأت کے بعد پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے مقالہ پیش فرمایا۔ دوسرا اجلاس جناب مولانا شمس الحق افغانی کی صدارت میں بعد نماز عصر شروع ہوا جو رات گئے تک جاری رہا اس دوران میں نماز مغرب اور عشاء ٹاؤن ہال کے سبزہ زار میں ادا کی گئی۔ مولانا محمد حنیف ندوی، حافظ احمد یار، مولانا محمد موسیٰ خان اور مولانا شمس الحق افغانی نے مقالات اور تقاریر سے شرکاء کانفرنس کو محظوظ فرمایا۔

تیسری نشست کی صدارت مولانا محمد مالک کاندھلوی نے کی مولانا مفتی محمد حسین نعیمی، مولانا ڈاکٹر محمد مظہر بقا، ڈاکٹر ذوالفقار علی ملک مولانا سید حامد میاں اور مدیر "برہان" مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے مقالات پیش کئے۔

چوتھی نشست کے صدر تھے جناب ڈاکٹر برہان احمد فاروقی اور مقالہ نگار جناب خالد ایم اسحق، مولانا محمد طاسین، ڈاکٹر امان اللہ خان مرزا محمد منور، ڈاکٹر ابصار احمد تھے۔

پانچویں اجلاس کا موضوع "پاکستان، مصور پاکستان اور قرآن حکیم" تھا اس اجلاس کی صدارت پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے کی۔

جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب، ڈاکٹر برہان احمد فاروقی اور خواجہ غلام صادق نے مقالات پیش فرمائے۔

چھٹا اجلاس بھرپور اور پر لطف مقالات کے ممتاز خطیب شاہ بلیغ الدین اور مولانا سید وصی مظہر ندوی کا خطاب سننے کے لئے لوگ امڈ پڑے تھے اس کے علاوہ محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی تقریر کا اعلان بھی اخبارات میں آچکا تھا اس لیے پروانے دیوانہ وار آئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی حاصل کانفرنس تقریر کے بعد جناب مولانا وصی مظہر ندوی نے خطاب فرمایا۔ اور تیسری قرآن کانفرنس بخیر و خوبی اختتام پذیر ہوئی۔

چوتھی قرآن کانفرنس

کے انعقاد کے لئے مارچ ۱۹۷۷ء کا انتخاب کیا گیا۔ مگر ۷ مارچ کو ملک میں عام انتخابات ہوئے تو ملکی فضا بے اطمینانی اور ہنگامہ آرائی کی زد میں آگئی چنانچہ بادلِ نخواستہ

یہ کانفرنس ملتوی کرنا پڑی ۔ سیاسی ہنگامی آرائی ایک عرصے تک جاری رہی اور پھر کہیں مہینوں بعد جاکر مارشل لاء کے ذریعے امن وسکون بحال ہوا ۔ چنانچہ موقع غنیمت جانتے ہوئے نومبر میں اس ملتوی شدہ کانفرنس کے انعقاد کا اعلان کر دیا گیا ۔ ۲۶، ۲۷ ، نومبر ۷۷ء کو جناح ہال لاہور میں منعقد ہونے والی اس کانفرنس کے لئے صدر پاکستان (اُس وقت صرف چیف مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر) جناب جنرل محمد ضیاء الحق نے تفصیلی پیغام ارسال کیا جسے ملکی پریس نے نمایاں طور پر جگہ دی اس کے علاوہ ریڈیو ، ٹی وی نے بھی اس پیغام کی مناسبت سے اس کانفرنس کو خصوصی اہمیت دی اس کانفرنس کے مختلف اجلاسوں میں دیگر اصحاب علم وفضل کے علاوہ شیخ الحدیث مولانا محمد گوندلوی ، پروفیسر محمد منور مرزا ، ڈاکٹر سلیم فارانی اور مفتی محمد حسین نعیمی نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ۔

پانچویں قرآن کانفرنس

لاہور میں چار قرآن کانفرنسیں ہو چکیں تو کراچی والوں نے یہ سعادت حاصل کرنے کا ارادہ ظاہر کیا مرکزی انجمن خدام القرآن کی مجلس منتظمہ نے بھی کراچی والوں کو اس سعادت میں حصہ دار بنانا مناسب خیال کیا اس لئے پانچویں قرآن کانفرنس کا انعقاد ۲۲، ۲۴ ، مارچ ۱۹۷۸ء کو آئی ، بی اے ہال کراچی میں ہوا ۔ اس کانفرنس میں مقالات اور تقریروں کے علاوہ ایک قرآنی نمائش کا اہتمام بھی کیا گیا تھا جسے شرکاء کانفرنس نے خوب سراہا ۔

پہلے اجلاس کی صدارت مولانا محمد ناظم ندوی نے کی اور مولانا جعفر شاہ پھلواروی ، سید امتیاز حسین بخاری ، ڈاکٹر غلام محمد اور پروفیسر محمد اسلم صاحب نے " عظمت و اعجازِ قرآن " اور قرآن ، سنتِ رسُول اور صحابہ کرام کے موضوع پر مقالات پیش کئے ۔

دوسرا اجلاس مولانا ظفر احمد انصاری کی صدارت میں منعقد ہوا جس کا موضوع " اُمّت مسلمہ کے مسائل کا حل قرآن حکیم کی ، روشنی میں " تھا ۔ سید وصی مظہر ندوی شیخ ظہور الحق ، نیاز احمد ایڈووکیٹ نے مقالات اور جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب ،

نے اسلام اور پاکستان کے موضوع پر دو گھنٹے کی تقریر کی ۔

تیسری نشست کے صدر جناب یوسف سلیم چشتی تھے اور اس نشست کی اہم خصوصیت جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی تقریر تھی جو آپ نے "علامہ اقبال اور قرآن حکیم" کے موضوع پر فرمائی ۔ جناب مصباح الدین شکیل نے بھی ایک مقالہ پیش کیا ۔

چوتھی نشست کا موضوع "قرآن اور فکر جدید" تھا اور صدارت جناب مولانا عبدالقدوس ہاشمی نے کی ۔ جناب ڈاکٹر بشارت علی، جناب مولانا محمد طاسین، شیخ حیدر علی، ڈاکٹر ابصار احمد اور جناب خالد ایم اسحاق ایسے فاضل مقررین نے خطاب کیا ۔

آخری نشست جناب مولانا محمد اسحق ندوی کی صدارت میں منعقد ہوئی موضوع تھا "قرآن، سنت اور صحابہ کرامؓ"، اور مقررین تھے مولانا محمد تقی عثمانی، شاہ بلیغ الدین، پروفیسر محمد یامین، اور حکیم فیض عالم صدیقی ۔ اس نشست میں خواتین کی بھاری تعداد نے بھی شرکت کی ۔ اندرونِ سندھ سے بھی مندوبین شریک ہوئے ۔

چھٹی قرآن کانفرنس

پانچویں قرآن کانفرنس کراچی میں منعقد ہوئی تو مرکزی انجمن خدام القرآن کراچی کے کارکن اُمید و بیم کی کیفیت سے دوچار تھے مبادا انتظامات میں کمی، کوتاہی رہ جائے اور مہمانوں کے سامنے سُبکی ہو ۔ لیکن یہ کانفرنس کامیابی سے ہمکنار ہوئی تو پھر اگلی کانفرنس بھی کراچی میں کرانے کی آرزوئیں مچلنے لگیں ۔ مجلس منتظمہ نے بھی اس خواہش کا احترام کیا اور چھٹی کانفرنس کے لئے کراچی کا انتخاب کر لیا ۔ یہ کانفرنس ۲۲ تا ۲۴ مارچ ۷۹ء کو انسٹی ٹیوٹ آف بزنس ایڈمنسٹریشن کراچی کے آڈیٹوریم میں منعقد ہوئی کل پانچ اجلاس ہوئے جن سے ڈیڑھ درجن کے قریب مقررین نے خطاب کیا ۔ ان میں قانون دان بھی تھے اور علماء بھی ۔ عدلیہ سے تعلق رکھنے والے معزز حضرات بھی اور ماہرین تعلیم بھی ۔ مذہب اور تصوف کی وادیوں میں گھومنے پھرنے والوں کی نمائندگی بھی تھی اور حکمت و فلسفہ آشناؤں کی بھی ۔

یوں اس کانفرنس میں "دستوری، قانون اور سیاسی مسائل اور قرآن مجید" "حکمت و فلسفہ کے مسائل اور قرآن مجید" "اخلاقی و روحانی مسائل اور قرآن مجید" "معاشی و اقتصادی مسائل اور قرآن مجید" اور "ثقافتی و معاشرتی مسائل اور قرآن حکیم" ایسے متنوع موضوعات زیر بحث آئے۔ ملک کے جن جید فضلا و علما نے خطاب کیا ان میں جسٹس شیخ ظہور الحق، جناب خالد ایم اسحٰق، پروفیسر اظہر علی صدیقی، جناب نیاز احمد خان، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، مولانا ظفر احمد انصاری، پروفیسر یوسف سلیم چشتی، مولانا محمد ناظم ندوی، مولانا محمد تقی عثمانی، ڈاکٹر غلام محمد، خواجہ شمس الدین عظیمی، ڈاکٹر عبدالرزاق، پروفیسر محمد اسلم، ڈاکٹر شرافت علی ہاشمی ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن، مولانا محمد طاسین اور سالار کاروان جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب شامل تھے۔

ساتویں قرآن کانفرنس ۱۸ تا ۲۱ اپریل ۱۹۸۰ء منعقد ہوئی اس کے انعقاد کی سعادت لاہور کو حاصل ہوئی اس مرتبہ کچھ پروگرام اس طرح سے ترتیب دیا گیا کہ اسکی کچھ نشستیں تو ٹاؤن ہال (جناح ہال) میں منعقد ہوں اور کچھ قرآن اکیڈمی میں۔ چنانچہ پہلی نشست ٹاؤن ہال میں حافظ نذر احمد صاحب کی زیر صدارت شروع ہوئی۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے جناب اختر الواسع، جناب ثناالہدا انصاری جناب پروفیسر مرزا محمد منور جناب حافظ احمد یار اور جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے خطاب فرمایا۔

دوسرا اجلاس ڈاکٹر بشیر احمد صدیقی کی صدارت میں ہوا۔ اور صاحب صدر کے علاوہ جناب سید حامد میاں کا مقالہ پیش کیا گیا۔

تیسرے اجلاس کے دو صدر تھے جناب جسٹس تنزیل الرحمٰن اور جسٹس قاضی محمد گل۔ اس کے علاوہ جسٹس کریم اللہ دُرّانی بھی شریک اجلاس تھے، جناب محمد تقی امینی کے مقالے کے علاوہ حافظ عبدالرحمٰن مدنی جناب جسٹس کریم اللہ دُرّانی اور جسٹس تنزیل الرحمٰن نے خطاب فرمایا۔

چوتھے اجلاس کے صدر جناب ڈاکٹر برہان احمد فاروقی تھے مولانا محمد حسین میر نے "قرآن حکیم اور محروم طبقات" کے موضوع پر مقالہ پڑھا۔ جسٹس کریم اللہ

اسلامی

نظامِ معیشت

چند اہم نکات

★ ——— ڈاکٹر اسرار احمد

ڈاکٹر صاحب نے یہ تقریر سب سے پہلے چھٹی قرآن کانفرنس کے موقع پر کراچی میں کی۔ بعد ازاں موصوف نے قرآن اکیڈمی لاہور میں اور پھر زرعی یونیورسٹی فیصل آباد میں انہی نکات کو دہرایا۔ اسے تینوں مقامات پر بہت ہی پسند کیا گیا۔ فیصل آباد یونیورسٹی کے وسیع و عریض ہال میں جو طلبا اور اساتذہ سے بھرا ہوا تھا، ڈاکٹر صاحب نے یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب ڈاکٹر غلام رسول چوہدری کی زیرِ صدارت جب یہ تقریر

ارشاد فرمائی تو سامعین میں ایک درجن کے قریب ماہرین معاشیات (پی۔ایچ۔ڈی) موجود تھے، جنہوں نے اس تقریر کی بہت تعریف کی اور کہا کہ تصویر کا یہ رخ پہلی بار ان کے سامنے آیا ہے۔ یہ تقریر ٹیپ کر لی گئی۔ جسے برادرم سید ارشاد احمد نے صفحہ قرطاس پر منتقل کیا ہے۔ عدیم الفرصتی کی بنا پر ڈاکٹر صاحب اس پر نظر ثانی نہیں کر سکے۔ (قاضی عبد القادر)

آج کا انسان مکمل طور پر ایک معاشی حیوان بن چکا ہے۔ انسانی اجتماعیات میں سب سے اہم پہلو اقتصادیات اور معاشیات کا ہے۔ اب جب کہ عالم اسلام میں اسلامی نشاۃ ثانیہ کا جذبہ ابھر رہا ہے، وحدتِ اُمت کا تصور ایک زندہ حقیقت کی شکل اختیار کرتا نظر آتا ہے اور خاص طور پر پاکستان میں اسلامی نظام حیات کی طرف جو پیش رفت ہوئی ہے، صحیح راستے پر چلنے کا عزم ہے، ارادے ہیں، تو فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلام کا معاشی نظام ہے کیا؟ بعض لوگوں نے ناسمجھی کی وجہ سے یا بدنیتی کے ساتھ اس تصور کو عام کیا ہے کہ موجودہ اقتصادی اور معاشی نظام ذرا سی کمی بیشی کے ساتھ اسلامی نظام کی صورت اختیار کر سکتا ہے۔ اگر زکوٰۃ اور عشر کا نظام نافذ کر دیا جائے، سود کی لعنت کا خاتمہ ہو اور شرکت و مضاربت کے اصولوں پر کاروبار شروع ہو جائے تو بس یوں سمجھیئے کہ اسلام کا معاشی نظام نافذ ہو گیا۔ خواہ بنیادی طور پر معیشت کا ڈھانچہ وہی رہے جس نے یہاں بدترین قسم کی سرمایہ داری کو جنم دیا ہے۔ اسلام کا یہ معاشی تصور ہی اس مغالطے کا باعث بنا ہے کہ اسلام کے پاس انسان کے معاشی مسائل کا حل موجود نہیں۔

اسلام کے معاشی نظام کے سلسلے میں یہ معروضات ایک طالب علمانہ کوشش ہی قرار دی جا سکتی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے معاشیات اور اقتصادیات کے اس دور میں اس اہم انسانی مسئلے سے صرفِ نظر کر کے اسلامی تعلیمات کی ترویج اور قرآنی افکار کی موثر تبلیغ کی کوششیں کامیاب نہیں ہو سکتیں۔ اس لئے قرآن مجید نے معاشیات کے ضمن میں جو احکام دیئے ہیں اور جن مقاصد اور حکمتوں کو پیش نظر رکھ کر

یا احکامات وضع کئے گئے ہیں انکے متعلق چند بنیادی باتیں عرض کی جائیں گی ۔ یہ وضاحت کر دینا بھی ضروری ہے کہ اسلام کے معاشی نظام پر بحث کرتے ہوئے فلسفیانہ موشگافیوں اور عالمانہ مباحث کے بجائے ان اصطلاحات کا سہارا لیا گیا ہے جن کے لوگ عادی ہیں مثلاً لفظ "کیپٹلزم" ہے ۔ اس کے بارے میں لوگوں کو سب کچھ نہیں تو بہت کچھ معلوم ہے اس کی اساس کیا ہے اس کا تشئہ کار کیا ہے ۔ اس طرح "سوشلزم" کو لے لیجئے یہ لفظ تو اس قدر رواج پا گیا ہے کہ ہمارے ہاں عام لوگ بھی جو زیادہ پڑھے لکھے نہیں اسے بڑی روانی سے بولتے ہیں ۔ اور اس کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں "استحصال" جیسا بھاری بھرکم لفظ بھی اب ریڑھی چلانے والے، تانگے بان کی زبان پر ہے اور وہ اسے بآسانی استعمال کرتا ہے۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ لوگ جن الفاظ و اصطلاحات سے مانوس ہیں بات کو انہی کے حوالے سے آگے بڑھایا جائے گا ۔ گو یہ احساس بھی دامن گیر ہے کہ ان الفاظ و اصطلاحات سے مرعوبیت کا الزام عائد کیا جائے ۔ یا OVERSIMPLFCATION کا مجرم گردانا جائے۔ لیکن دونوں خدشات کے باوجود یہی ذریعہ ابلاغ اس لئے استعمال کیا گیا ہے کہ ذہنوں تک رسائی کا یہ طریقہ سب سے زیادہ مناسب اور موثر ہے ۔

دنیا میں ہر نظام، فکری اور علمی دو پہلوؤں پر مشتمل ہوتا ہے ۔ کسی بھی نظام کو اس کے نظریاتی پس منظر سے جدا کر کے زیر بحث نہیں لایا جا سکتا کیونکہ اس پس منظر کا اس نظام سے گہرا تعلق ہوتا ہے ۔

اسلام کے معاملے میں تو یہ اصول مانے بغیر اس کے نظام حیات پر گفتگو ہی نہیں کی جا سکتی ۔ اس کا اعتقادی یا فکری پس منظر اور اس کی نظریاتی اساس کو ایمان سے تعبیر کرتے ہیں ۔ اور حقیقتاً یہی بنیاد ہے ۔ جس پر اسلامی نظام کی عمارت قائم ہے ۔

ایمان کیا ہے ؟

خدا اور اس کے رسول پر اس یقین کے ساتھ ایمان کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اور جو راہ اس کے پیارے رسول صلے اللہ علیہ وسلم نے دکھائی اس پر چلے بغیر اس زندگی اور آخرت کی زندگی میں کامیابی ممکن نہیں اور اس بات کا یقین کہ آخرت میں ہمارے ہر عمل کا نیکی اور برائی کی صورت میں بدلہ ملے گا ۔ یہی یقین ہی ایمان کی وہ بنیاد فراہم کرتا ہے کہ ہماری یہ دنیوی زندگی ہی حرف آخر نہیں بلکہ اصل زندگی تو موت کے بعد کی ہے اور

انسان کا اصل مسئلہ بعد الموت زندگی سے متعلق ہے۔ رہی اس دنیا کی ناپائیدار زندگی تو یہ فانی ہے، عارضی ہے، اس کی کوئی حیثیت نہیں اور اگر کچھ ہے بھی تو نہ ہونے کے برابر۔ ایمان کی یہ دو بنیادیں قرآن مجید کی ایک آیت میں یوں سموئی ہوئی ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون واللہ ہی ہمارا مبدأ و معاد ہے ہم اسی کی طرف سے آئے ہیں اور اسی کی طرف جانے والے ہیں، گویا یہ ایک سفر ہے جب فی الواقع ایمان کی یہ دو بنیادیں قائم ہو جائیں تو اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کن فی الدنیا کانک غریبٌ او عابر سبیل ۔ دنیا میں ایک اجنبی یا راہ چلتے مسافر کی طرح زندگی بسر کرنے کا سلیقہ آجاتا ہے۔ راہ چلتے مسافر کو اس راہ گذر سے جتنی دلچسپی ہوتی ہے مومن کو اس دنیا سے بھی اتنی ہی دلچسپی ہوتی ہے اور بس۔

کمیونزم اور کیپٹلزم

اس گفتگو سے دو نتیجے اخذ ہوتے ہیں ایک تو یہ کہ اگرچہ سوشلزم یا کمیونزم اور کیپٹلزم ایک دوسرے کی ضد ہیں ایک مشرق ہے اور دوسرا مغرب۔ لیکن اسلام کے مقابلے میں ان دونوں میں ایک قدر مشترک ہے یہ آپس میں تو متضاد ہیں، متقابل ہیں۔ لیکن اسلام کے مقابلے میں اپنے فکری پس منظر کے ساتھ یہ ایک ہی تنے کی دو شاخیں ہیں۔ اسلام جہاں مادیت کے مقابلے میں روحانیت اور اس دنیوی زندگی کے مقابلے میں آخرت کی دعوت دیتا ہے یہ دونوں نظام صرف اور صرف مادہ پرستی کی بنیاد پر قائم ہیں۔ کیپٹلزم تھا جس نے ایک قدم آگے بڑھایا اور جدلیاتی مادیت کی صورت اختیار کر لی اور مادیت ہی کی بنیاد ہے جس کے ساتھ کیپٹلزم کا دم چھلا لگا ہوا ہے۔

اسلام کا معاملہ ان دونوں سے مختلف ہے یہی وجہ ہے کہ اسلام اپنی ہی قائم کردہ بنیادوں پر اپنے مکمل ڈھانچے میں قائم ہو سکتا ہے۔ اور کسی قسم کی پیوند کاری قبول نہیں کرتا لہٰذا جب تک وہ نظریاتی بنیاد استوار نہ ہو اسلامی نظام کا ڈھانچہ قائم کرنے کا خیال گاڑی کے آگے گھوڑا باندھنے کے مترادف ہوگا۔ پہلے نظریاتی اساس کا استحکام ضروری ہے۔ اس لئے کہ اسلام، ایمان کی بنیاد پر قائم ہوگا اس کے علاوہ وہ کسی جڑ یا بنیاد پر قائم نہیں ہو سکتا۔

دوسری بات یہ ہے کہ اصل اہمیت معاد کی ہے معاش کی نہیں۔ ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت اس بات کی متقاضی ہے کہ اصل اہمیت معاد، آخرت و عاقبت کو ہو

اس کے ساتھ ہی ساتھ اس سے انکار بھی ممکن نہیں۔ کہ اسلام نے عدل اور قسط کے قیام کو بنیادی حیثیت دی ہے۔ شریعت، انزال کتب، بعثت رسل کا مقصد، دین کا پورا ڈھانچہ، مرکزی خیال قیام عدل و قسط ہے۔ عدل و انصاف پر مبنی ایک نظام کا قیام گویا اسلام اور ایمان کا بنیادی تقاضہ ہے چنانچہ قرآن مجید میں اللہ تعالےٰ کی ایک صفت قائما بالقسط (انصاف قائم کرنے والا) بھی آئی ہے۔ اس کے علاوہ ارشاد خداوندی ہے

یاایھا الذین آمنوا کونوا	اے اہل ایمان عدل اور قسط کے
قوامین بالقسط شھداء للہ[1]	قائم کرنے والے اور اللہ کے گواہ بنو۔
یاایھا الذین آمنوا کونوا	اے اہل ایمان اللہ کے گواہ بنو تاکہ
قوامین للہ شھداء بالقسط[2]	عدل و انصاف قائم رہو۔

ایک بات کو دو پیرائیوں میں بیان کیا گیا ہے۔ لیکن اس خوبصورت انداز میں کہ روح وجد کرنے لگتی ہے اس کے علاوہ فرمایا۔

لقد ارسلنا رسلنا بالبینات	ہم نے اپنے رسول بھیجے، بیّنات
وانزلنا معھم الکتاب و	نازل فرمائیں اور ہم نے میزان اتاری
المیزان لیقوم الناس[3]	اس لئے کہ لوگ عدل و انصاف پر
بالقسط	کاربند رہیں۔
وقل امنت بما انزل اللہ	میں ایمان رکھتا ہوں اس پر جو اللہ
من کتاب وامرت	تعالےٰ نے اتارا مجھ پر اور مجھے حکم
لاعدل بینکم	ہوا ہے کہ میں تمہارے درمیان
	عدل کروں۔

چنانچہ فاتح ایران حضرت سعد بن ابی وقاص نے جب ایرانیوں سے پوچھا کہ آپ ہم پر کیوں حملہ آور ہوئے تو آپ نے جواباً فرمایا۔

انا قد ارسلنا لنخرج الناس	ہمیں بھیجا گیا کہ ہم لوگوں کو جہالت
من ظلمات الجھالۃ الی نور	کے اندھیروں سے نور ایمان کی طرف

---

[1] النساء [2] مائدہ [3] الحدید [4] الشوریٰ [5]

الایمان ومن جور الملوک	اور شہنشاہی استبداد سے نجات
الی عدل الاسلام	دلاکر عدل اسلام سے روشناس
	کرائیں۔

اسی طرح حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بیعتِ خلافت کے بعد جو خطبہ ارشاد فرمایا وہ اسلامی مملکت کے اصول متعین کرتا ہے آپ نے فرمایا "تم میں سے ہر قوی میرے نزدیک ضعیف ہے جب تک کہ اس سے حق وصول نہ کرلوں اور تم میں سے ہر ضعیف میرے نزدیک قوی ہے جب تک کہ اسے اس کا حق نہ دلوادوں۔" گویا نظام عدل و قسط کا قیام، اسلامی ریاست کا بنیادی مقصد ہے۔

عدل۔ اسلامی نظام کا امتیازی سلوگن

ہر نظام میں کچھ الفاظ ایسے ہوتے ہیں جو اپنے مفہوم کے اعتبار سے اس نظام کا امتیازی سلوگن بن جاتے ہیں کیپٹلزم میں آزادی (FREEDAM) کی تکرار ملے گی۔ یہ گویا ان کے فکر کی بنیاد اور مرکز و محور ہے اس طرح سوشلزم یا کمیونزم میں مساوات کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اس میں نوع انسانی کیلئے نشش ہے۔ اس مرحلے پر یہ بات ذہن میں رکھیئے کہ دونوں اعلیٰ قدریں ہیں۔ آزادی بھی ایک اعلیٰ قدر ہے اور مساوات بھی، اُن کے مقابلے میں اسلام نے عدل کا تصور دیا ہے۔ وہ نہ تو آزادی اور مساوات کے درمیان عدل کا راستہ تجویز کرتا ہے۔ نہ تو آزادی اس قدر بڑھ جائے کہ مساوات کو ہڑپ کر جائے اور نہ مساوات کا ہوا کھڑا ہو کہ آزادی جیسی اعلیٰ قدر سے انسانی معاشرہ محروم ہو جائے۔ آزادی کی قیمت پر مساوات اور مساوات کی قیمت پر آزادی، اسلام ان دونوں کے حق میں نہیں۔ اسلام عدل چاہتا ہے اور یہی وہ لفظ ہے جسے اسلام کا امتیازی سلوگن قرار دیا گیا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس دنیا میں نظام عدل کے قیام کی آخر غرض کیا ہے۔ اس طرف انسانی اجتماعیات کے بہت بڑے عالم حضرت شاہ ولی اللہؒ نے توجہ دلائی ہے وہ فرماتے ہیں:۔

قرآن حکیم کی واضح تعلیمات کے مطابق مسلم معاشرے کو حکم دیا گیا ہے کہ نہ اسراف کیا جائے نہ تبذیر، بلکہ راہ اعتدال اختیار کی جائے۔ اسراف کا مطلب ہے حد سے زیادہ خرچ کرنا اور تبذیر سے مراد ہے بیجا اور فضول خرچ کرنا۔

(۱) وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا إِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ۝ [1]

کھاؤ اور پیو لیکن اسراف نہ کرو۔ بے شک وہ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

(۲) وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ۝ إِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا إِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ۝ [2]

اور بے جا خرچ نہ کرو۔ بے شک بے جا خرچ کرنے والے شیطانوں کے بھائی ہیں۔

(۳) وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً إِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ۝ [3]

اور اپنے ہاتھ کو اپنی گردن کیساتھ باندھ کر نہ رکھو اور نہ اُسے بالکل ہی کھول دے ورنہ تو پشیمان خالی ہاتھ ہو کر بیٹھ جائے گا۔

(۴) وَالَّذِيْنَ إِذَآ أَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ۝ [4]

اور (رحمٰن کے بندے) وہ لوگ ہیں جو خرچ کرتے ہیں تو فضول خرچی نہیں کرتے اور نہ تنگی کرتے ہیں بلکہ ان کا خرچ ان دونوں کے درمیان اعتدال پر ہوتا ہے۔

عموماً معاشرے میں تین قسم کے معیار زندگی پائے جاتے ہیں:۔

۱۔ رفاہیت بالغہ یعنی عیاشیانہ معیار زندگی جس میں اعلیٰ سے اعلیٰ درجے کی پسند کی جاتی ہے۔ اس طرح حد سے زیادہ بلکہ اکثر بے جا خرچ کیا جاتا ہے اور دولت کو ضائع کیا جاتا ہے۔

۲۔ رفاہیتِ ناقصہ یعنی پست معیار زندگی۔ جس میں زندگی کی ضروریات بھی اس طرح حاصل نہیں ہوتیں۔ اور جانوروں کی سی زندگی بسر کی جاتی ہے۔

۳۔ رفاہیتِ متوسطہ یعنی درمیانہ معیار زندگی جس میں زندگی کی ضروریات متوسط درجے میں حاصل ہوتی ہیں اور انسان اتنی فراغت پاتا ہے کہ وہ اپنی اور

---

[1] اعراف [2] بنی اسرائیل [3] بنی اسرائیل [4] الفرقان

دوسروں کی بھلائی کے لئے بھی کوئی کام کرسکے اور خدا کو بھی یاد کرسکے ۔

"اللہ تعالیٰ نے رفاہیت بالغہ (عیاشی) کو ناپسند کیا ہے اور ایسی معاشرت اختیار کرنے سے منع فرمایا ہے جس سے انسان طلبِ دنیا کے ہی اندر اُلجھ کر رہ جائے اور معیشت کی باریکیوں میں اتر جائے اور اس کے اندر انتہائی تنعم اور غلو کرنے لگے ۔ چنانچہ ریشم اور سونے چاندی کے برتن اور بھاری زیورات مثلاً کنگن ، گلوبند ، ہار طوق ، پازیب وغیرہ کا استعمال اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند ہیں ۔ کیونکہ یہ چیزیں انسان کو اسفل السافلین میں پہنچا دیتی ہیں اور انسانی ، افکار کو مختلف قسم کی تاریکیوں میں اُلجھا دیتی ہیں ۔ رفاہیت کی اصل حقیقت یہ ہے کہ معاشرتی زندگی میں اچھی چیزیں طلب کی جائیں اور ادنےٰ سے اعراض کیا جائے ۔ لیکن رفاہیت بالغہ یہ ہے کہ ایک ہی جنس میں سے سب سے اعلیٰ کا انتخاب کیا جائے ۔" (حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ۔ صفحہ ۱۰۷)

رفاہیت ناقصہ عموماً ان لوگوں کا معیارِ زندگی ہوتا ہے جو آبادیوں سے دُور پہاڑی علاقوں میں رہتے ہیں اور ان کا حال وحشی جانوروں کا سا ہوتا ہے [1] شہروں کے وہ لوگ بھی اسی ذیل میں آتے ہیں جو دوسروں کی خاطر محنت کرتے ہیں مگر انہیں پُورا معاوضہ نہیں ملتا ۔ پھر ان پر طرح طرح کے ٹیکس لگا دیئے جاتے ہیں جس سے ان کی حالت گدھوں اور بیلوں کی سی ہوجاتی ہے جن سے سخت کام لیا جاتا ہے اور محض زندہ رہنے کے لئے کچھ کھانے کو دے دیا جاتا ہے ۔ پھر ان کی حالت یہ ہوجاتی ہے کہ وہ محنت و مشقت سے فرصت ہی نہیں پاتے اور نہ وہ سعادت اخرویہ کی طرف متوجہ ہوسکتے ہیں ۔ بلکہ ان میں سعادتِ اخرویہ کا احساس ہی فنا ہوجاتا ہے اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ ملک بھر میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں رہتا جو دین کے مطابق کوئی حرکت کرسکے ۔ [2]

اگر اس طریقے سے انسان جکڑے ہوئے ہوں جس طرح بنی اسرائیل کو فرعونیوں نے جکڑ ہوا تھا ، صبح سے لے کر شام تک ان سے بیگار لی جارہی ہے ، کسی اور بات یا اعلیٰ قدر کی طرف متوجہ ہونے کی انہیں فرصت ہی نہیں ہے ۔ اس طرح اگر کسی

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ بحوالہ میثاق ۱۹۶۹ء

انسانی معاشرے میں معاشی ناہمواری کی یہ کیفیت ہو جائے کہ لوگوں کی اکثریت صرف روٹی کے حصول میں سرگرداں ہو۔ معاملہ جب یہ ہو جائے کہ انسان بنیادی ضروریات کی فراہمی کے لئے کمر توڑ دینے والی محنت کرے اور پھر بھی اس کی ضروریات پوری نہ ہوں تو انسان کا حیوانی سطح پر آجانا کوئی بعید از قیاس بات نہیں۔ اس بنا پر اسلام، نظام عدل و قسط قائم کرنا چاہتا ہے نہ صرف قانونی نظام میں بلکہ سماجی عدل بھی۔ تاکہ لوگ زیادہ سے زیادہ اللہ کی معرفت حاصل کریں۔ اسی سے لو لگائیں، اس سے محبت کریں۔ اپنے مقصد تخلیق کو پورا کریں اور یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ انہیں اس کے لئے فرصت ہو، وقت ملے اور یہ نہ کہہ سکیں۔

ع ! تجھ سے بھی دل فریب ہیں غم روزگار کے

عدل، جس میں اس نے آزادی اور مساوات دونوں قدروں کو خوبصورت انداز میں سمویا ہے۔ کیا ہے؟ اور اسلام کس قسم کا معاشی و اقتصادی نظام قائم کرنا چاہتا ہے؟ اس کی وضاحت سے قبل اس حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ اسلام کے معاشی نظام کے دو پہلو یا یوں سمجھیئے کہ دو حصے ہیں مگر اس طرح کہ دونوں اپنی جگہ ایک مکمل نظام کا نقشہ پیش کرتے ہیں دونوں کا اپنا ایک فلسفہ ہے اپنا نظریہ ملکیت ہے دونوں کا نظریہ حقوق ہے۔ دونوں کا اپنا نظریہ قدر زائد ہے۔ معاشی نظام میں اہمیت رکھنے والی تمام چیزیں ان دونوں نظاموں میں اپنا جداگانہ فلسفہ رکھتی ہیں۔ سورہ رحمٰن کی اس آیت کے مطابق۔

مرج البحرین یلتقیین	دو رو ئیں ہیں جو برابر چل رہی
بینھما برزخ لا یبغین	ہیں مگر ان کے درمیان ایک غیر
۱ے	مرئی پردہ حائل ہے۔ جو انہیں
	باہم مدغم نہیں ہونے دیتا۔

بالکل اسی شکل میں یہ دونوں نظام موجود ہیں اور اسلام جو مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے۔ وہاں دونوں کے حسین امتزاج سے قائم ہوتا ہے۔

۱۱

۱ے الرحمٰن

ہمارے ہاں غلط بحث ہوتی ہے اور ہر شخص اپنے نقطۂ نظر کے مطابق اسلام کے معاشی نظام کی تشریح و تعبیر کرتا ہے۔ جو لوگ سوشلزم اور کمیونزم سے متاثر ہیں وہ انفرادی ملکیت کی کامل نفی کرتے ہیں۔ ضرورت سے زائد ہر چیز لینے کی بات کرتے ہیں اور دوسرا پہلو یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ مثلاً قانون وراثت بھی تو قرآن مجید میں موجود ہے اس کے علاوہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے قائم کردہ نظام میں بھی جبری مساوات کی نفی کر دی گئی ہے۔ صرف یہی نہیں کہ جائز ذرائع سے کمائی ہوئی دولت پر تصرف بلکہ وراثتاً جائداد کی منتقلی کا حق بھی تسلیم کیا گیا۔ دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو کمیونزم سے خار کھاتے ہیں وہ اسلام کے قانونی نظام کا دم بھرتے اور اس کے روحانی نظام کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ انفرادی ملکیت کو اس قدر نمایاں کرتے ہیں کہ ایک استحصالی سرمایہ دارانہ نظام کا نقشہ آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔

یہ دونوں قسم کے نقطۂ ہائے نظر کسی غلط فہمی کی بنا پر بھی ہو سکتے ہیں۔ اور خلوص نیت کے ساتھ بھی۔ اسلام کے قرن اوّل میں بھی یہ غلط فہمی پیدا ہوئی۔ چنانچہ حضرت ابوذر غفاری نے جن پر زہد اور فقر کا غلبہ تھا۔ آیۂ کنز[1] کو ظاہری معنوں پر محمول کیا اور اس رائے کا اظہار کیا کہ سونا چاندی اور سرمایا ایک لمحے کے لئے بھی اپنے پاس رکھنا حرام ہے۔ اس سے ایک بڑا مسئلہ پیدا ہو گیا۔ خلافت راشدہ نے ان کی اس رائے کو انتہا پسندانہ قرار دیا۔ چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں انہیں مدینہ بدر کیا گیا۔ اور مدینہ منورہ سے باہر ہی ان کا انتقال ہوا۔ ان کے زہد کی شدت کا یہ عالم تھا کہ جب انتقال ہو رہا تھا تو صرف ان کی اہلیہ محترمہ ان کے پاس تھیں۔ گھر میں ضرورت کی چند چیزیں تھیں مگر ان کے احساسات یہ تھے کہ ان کی موجودگی پر بھی پریشان تھے۔ اور بار بار کہتے تھے

"حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا تم اپنے گرد سانپ اور بچھو جمع کر لو گے۔ اور یہ مجھے نظر آ رہے ہیں" اہلیہ محترمہ نے کہا۔ کہاں ہیں وہ سانپ اور بچھو جو ہم نے

---

[1] وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۔ (التوبہ)

جمع کر لئے ہیں۔ بولے وہ دیکھو توا ہے، استعمال کے کپڑے ہیں یہ سب کچھوہی ہیں۔
یہ صحیح ہے کہ اسلام قانونی نظام سے رُوحانی نظام کی طرف قدم بڑھانے کا تقاضا کرتا ہے
وہ چاہتا ہے کہ انسان اس کی طرف پیش قدمی کرے۔ اور یہی مغالطہ حضرت ابوذرغفاری
کو کامل خلوص کے ساتھ لاحق ہوا۔ لیکن آج بدنیتی کے ساتھ جان بوجھ کر یہ غلط فہمی پیدا
کی جارہی ہے کیونکہ اب تو ہمارے سامنے پورے کا پورا نظام موجود ہے اور قرآن و حدیث
کے حوالے سے موجود ہے ایک پہلو سے صرف نظر کرنا اور دوسرے پہلو کو نمایاں کرنا اور اسے
پروجیکٹ ( ) کرنے کے لئے دلیلیں فراہم کرنا کسی طرح بھی حقیقت
پسندی نہیں۔

چار اصول اسلام کے اخلاقی یا رُوحانی نظام کے چار اصول ہیں (۱) ملکیت
کی کُلّی نفی (۲) انسان کو جو کچھ ملتا ہے وہ اس کا کسب نہیں بلکہ
اللہ کا فضل ہے، اس کی عطا ہے (۳) انسان کا حق اس کی جائز ضروریات ہیں بعض
احادیث میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے انہیں متعین بھی فرمادیا ہے۔ دو وقت
کھانے کے لئے سامان، سر چھپانے کے لئے چھت دو جوڑے کپڑے اور اخلاق و کردار
کی حفاظت کے لئے بیوی۔ (۴) اب جو کچھ انسان کے پاس بچ رہے اسے دوسروں
کی ضروریات کے لئے وقف کردے۔ گو قانونی طور پر اسے اس پر حق تصرف حاصل ہے۔
لیکن اخلاقی تقاضا یہ ہے کہ وہ دوسروں کی طرف منتقل ہو۔ یہ اپنے طور پر ایک مکمل نظام
ہے اس میں ملکیت کا نظریہ بھی موجود ہے اپنے حق کا تصوّر بھی اور اگر قدرِ زائد ہے
تو اس کا مصرف بھی موجود ہے۔

قرآن مجید میں ربوا کا لفظ دو چیزوں کے ضد کے طور پر آیا ہے (۱) ربوا بمقابلہ بیع
واحل اللہ البیع وحرم الربوا [۱] (۲) ربوا بمقابلہ صدقات اور تزکیہ نفس
کے خرچ کرنے کے لئے۔ اور وما آتیتم من زکوٰۃ تریدون وجہ
اللہ فاولئک ھم المضعفون [۲] اسلام کی رُوحانی اور ایمانی تعلیمات میں ربوا
صدقات کے مقابلے میں آیا ہے۔ یمحق اللہ الربوا ویربی الصدقت
(اللہ تعالیٰ ربوا کو گھٹاتا اور صدقات کو بڑھاتا ہے) [۳]
ان آیات میں صدقات کے مقابلے میں ربوا کا لفظ آیا ہے یوں سمجھئے کہ ایک انسان

---

[۱] البقرہ [۲] الروم [۳] البقرہ

مثلاً ملازم کی ضرورت پوری ہونے کے بعد کچھ سرمایہ اس کے پاس جمع ہوگیا ہے اب اس فاضل سرمائے کے دو مصرف ہیں یا تو وہ اسے کسی کاروبار میں لگائے اس صورت میں محنت اس میں شامل نہیں ہوگی۔ فاضل سرمائے میں جو بڑھوتری ہوگی وہ بھی ربوا قرار پائیگی۔ اس کا صحیح مصرف یہ ہے کہ اسے محتاجوں اور مسکینوں میں تقسیم کیا جائے، وہ لوگ جن کے پاس کاروبار کی بنیاد ڈالنے کے لئے سرمایہ موجود نہیں انہیں سرمایہ فراہم کیا جائے تاکہ وہ رزق حلال باعزت طریقے سے حاصل کرنے کے قابل ہوسکیں اُن کی مجبوری سے فائدہ اٹھاکر ان کی محنت میں سے حصہ وصول کرنا گو قانونی سطح پر جائز ہو بھی تو اخلاقی اور رُوحانی سطح پر یہ ممنوعات کی فہرست میں شامل ہوگا۔ اس لئے اس فاضل سرمائے کا مصرف یہ ہونا چاہیئے کہ ضرورت مند اس سے فائدہ اٹھائیں اور اگر زیادہ نہیں تو انہیں یہ سرمایہ بطور قرض حسنہ ہی دیا جائے۔ تاکہ وہ بھی اپنے پاؤں پر کھڑے ہوں اور معاشرے میں صاحب عزت اور صاحب حیثیت بن سکیں۔ قرآن کی اخلاقی اور رُوحانی تعلیمات کا یہی نکتہ ہے جسے اپناکر ایک غنی معاشرہ تشکیل دیا جاسکتا ہے۔

قانونی اور فقہی نظام

اسلام کا قانونی معاشی نظام ایک طرح کی کنٹرولڈ کیپٹلزم ہے کہ اس میں تینوں جبلی تقاضے موجود ہیں اس میں نجی ملکیت (PRIVATE OWNERSHIP) بھی ہے ذاتی دلچسپی بھی ہے اور آزاد معیشت کا تصور بھی۔ البتہ اس میں حلال اور حرام کی تفریق موجود ہے۔ پابندی کمانے پر نہیں بلکہ حلال سے تجاوز کرنے پر ہے۔ ملکی قانون حق تصرف تسلیم کرتا ہے۔ اور اپنی مرضی سے اللہ تعالےٰ کی راہ میں دینے کا تقاضہ بھی کرتا ہے البتہ جو فرض ہے مثلاً زکواۃ وہ جبراً وصول کی جائے گی لیکن زکواۃ کے علاوہ اس پر کوئی قانونی پابندی نہیں ہوگی۔ مگر ذہن میں رہے کہ اسلام نے اس قانونی نظام کو دو پہلوؤں سے حدود کا پابند کیا ہے تاکہ یہ ایک لعنت بن کر نوع انسان پر مسلط نہ ہوجائے۔ ایک تو وہ خطوط متعین کئے گئے۔ جنکی موجودگی میں سرمایہ کاری، سرمایہ داری بننے سے محفوظ رہے۔ دوسری طرف آزاد معیشت میں بعض لوگوں کے آگے بڑھ جانے اور بعض لوگوں کے پیچھے رہ جانے کے امکان کو تسلیم

کرکے جبری مساوات کے بجائے اس فرق و تفاوت کو بڑی حد تک ختم کرنے، اس درمیانی خلا کو پر کرنے کے لئے راستہ تجویز کرتا ہے۔ نظام زکوٰۃ اس سلسلہ کی ایک کڑی ہے اسلام نے ایک حد فاصل قائم کردی کہ جو بھی حد سے آگے بڑھ جائیں وہ مالدار ہیں۔ اور دینے کے مکلف ہیں اور جو اس حد تک نہیں پہنچ سکے وہ مستحق اور ضرورت مند ہیں۔ معروف معنوں میں پہلے والوں کو HAVE اور دوسروں کو HAVE NOT شمار کرلیجئے۔ لیکن یہ تقسیم آپ کے اختیارات کے تابع نہیں کہ آپ جسے چاہیں HAVE بنادیں اور جسے چاہیں HOWE NOT بنادیں۔ بلکہ نصاب کی ایک حد مقرر کردی ہے کہ اتنے اونٹ ہیں تو دینے والوں کی صف میں اس سے کم ہیں تو لینے والوں کی صف میں اس تقسیم کے بعد یہ اصول قائم کیا گیا کہ

توخذ من اغنیاءھم وترد الی فقراءھم ط

(اغنیاء سے لے کر مستحقین میں تقسیم کیا جائے گا)

تاکہ اس تفریق کا کسی حد تک خاتمہ کیا جاسکے جو معاشرے میں پیدا ہو کر بہت سی برائیوں کا باعث بنے گی۔ لیکن ایسا نہیں ہوگا کچھ لوگ تو ارتکاز دولت کرکے عیش و عشرت کی زندگی بسر کریں اور کچھ لوگ ضروریات زندگی سے بھی محروم رہ جائیں۔ اسلام ارتکاز احتکار دولت کا مخالف ہے۔ سرمائے کو گردش میں لانے کا متقاضی لیکن وہ سرمائے کی فطری گردش کے حق میں ہے۔ سرمائے کی وہ مصنوعی گردش جو سرمایہ دارانہ نظام کا خاصہ ہے۔ اسلام کے نزدیک پسندیدہ نہیں اس نے اصولاً یہ بات طے کردی کہ کی لَا یَکُوْنَ دولۃ بین الاغنیاء [1]

(دولت، سرمایہ داروں کے درمیان ہی الٹ پھیر میں نہ رہ جائے) ایک کروڑ پتی کی بیٹی ایک دوسرے کروڑ پتی کے بیٹے سے بیاہی گئی لاکھوں روپے کا جہیز اس گھر میں جمع ہوگیا جہاں کروڑوں روپے پہلے سے موجود ہیں سرمایہ تو گردش میں آیا لیکن مصنوعی انداز میں۔ اور معاشرے کو اس سے قطعاً کچھ فائدہ نہ پہنچا اور یہ سرمایہ نچلے طبقات تک منتقل نہیں ہوسکا۔ اسی طرح ایک سرمایہ دار کے بیٹے کی

---

[1] الحشر

سالگرہ پر لاکھوں روپے کے تحائف جمع ہوگئے ہیں ۔سرمایہ کی گردش کا عمل یہاں بھی وقوع پذیر ہوا لیکن بین الاغنیاء (سرمایہ داروں کے درمیان)

اسلام کا منشا یہ ہے کہ معاشرے میں جو بھی ذرائع پیداوار ہیں اور ان میں زمین سب سے بڑا ذریعہ پیداوار ہے ۔ان کی منصفانہ تقسیم ہو اور اس کا حاصل پورے معاشرے میں پھیلے کنٹرولڈ کیپٹلزم کی جو اصطلاح یہاں استعمال کی گئی اسے اب انٹرنلی مینج کیپٹلزم کے الفاظ میں ادا کیا جا رہا ہے ۔کیونکہ سرمایہ دارانہ نظام بھی یہ بات جان چکا ہے کہ ننگی اور عریاں سرمایہ داریت اس دور میں نہیں چل سکتی ۔اس کا کوئی مستقبل نہیں بلکہ وہ تو تباہی کی طرف لے جا رہی ہے ۔اقبالؒ کے الفاظ میں ۔

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکان نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہو گا ۔
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہو گا

سرمایہ دارانہ نظام کُلّی طور پر اپنے فلسفے کے ساتھ اب قابلِ قبول نہیں رہا اس کا کوئی مستقبل نہیں ہے اور وہ تباہی کے کنارے پر پہنچ چکا ہے ۔اس لئے اپنے تحفظ کے لئے کچھ قابلِ عمل اقدامات کر رہا ہے ۔جس کی نمایاں مثال برٹش سوسائٹی میں ملتی ہے ۔وہاں ان لوگوں کے لئے جو کام نہیں کر پاتے نان ایمپلائمنٹ الاؤنسز مقرر کر دیئے گئے ہیں ۔اس طرح سے بنیادی ضروریات کی کفالت ریاست اپنے ذمہ لے لیتی ہے ۔آزاد معیشت کا تصور بھی مجروح نہیں ہوتا ۔اور ضرورت مند لوگوں کی کفالت کا سامان بھی کر دیا جاتا ہے ۔لیکن غور کیا جائے تو اسلام کے نظامِ معیشت میں یہ اصول چودہ سو سال قبل طے کیا جا چکا ہے اور سرمایہ دارانہ نظام یا بے خدا معاشرہ جہاں ٹھوکریں کھا کر اب پہنچ رہا ہے ۔اسلام چودہ سو سال قبل اس طرف رہنمائی کر چکا ہے ۔اس نے اصول کے طور پر بتا دیا کہ کمانے کھانے کی آزادی ہے اور آگے بڑھنے کی بھی لیکن جو پیچھے رہ جائیں ان کی بنیادی ضروریات کی فراہمی معاشرہ

کا فرض ہے ۔ اور زکوٰۃ و عشر کا نظام اس سلسلے کی ایک کڑی ہے ۔

کفالت عامہ کے اصول کو کلیکٹو انشورنس بھی کہا جا سکتا ہے ۔ اس فرق کے ساتھ کہ انشورنس خواہ کسی قسم کی ہو اسے انسان اپنی کمائی میں بچت کرتا ہے ۔ لیکن اسلام نے جو اصول وضع کیا ہے اس میں ایک طبقہ بچاتا ہے اور جمع کرتا ہے ۔ لیکن ضروری نہیں کہ اس کا فائدہ بھی اسے پہنچے ۔ جس نے بچایا اور جمع کیا ہے ۔ بلکہ ایک طبقہ مالدار یا غنی ہے وہ بچاتا اور جمع کرتا ہے اور دوسرا طبقہ جو ضرورت مند ہے اس سے اپنی ضرورت پوری کرتا ہے اور اس کی یہ کفالت نظام زکوٰۃ اور عشر کے ذریعے سے ہوتی ہے ۔ اسلام کے اخلاقی نظام کو تو تفصیل سے بیان کر دیا گیا اب آئیے اس کے فقہی اور قانونی نظام کی طرف جس میں دو باتیں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں ۔

حلال و حرام کی حدود

اسلام پہلی شرط حلال و حرام کی پاسداری کی عائد کرتا ہے تاکہ معاشرے میں یہ تمیز اٹھ جانے کے بعد جو طوفان بدتمیزی برپا ہوتا ہے اور انسانیت کی حیوانیت میں تبدیلی کا عمل شروع ہوتا ہے اس کا سدباب کیا جا سکے اس کے بعد ان اقدامات پر نظر ڈالیئے جو قرآن مجید اپنے معاشی نظام میں وضع کرتا ہے اور عش عش کیجئے لیکن یہ وضاحت بہرحال ضروری ہے ۔ کہ قرآن مجید معاشیات کی کتاب نہیں ہے کہ اس نے عنوانات قائم کر کے معاشی اصطلاحات پر بحث کی ہو اور ایک ایک نکتے کی وضاحت ضروری سمجھی گئی ہو لیکن کتاب ہدایت ہونے کی بنا پر قرآن مجید میں زندگی کے اس پہلو سے بھی رہنمائی کی گئی ہے ۔ قرآن مجید نے جو ہدایات دی ہیں ان سب کا بنیادی فلسفہ یہ ہے کہ اسلام اپنے قانونی نظام میں بھی زیادہ سے زیادہ محنت پر انحصار کرتا اور سرمایہ کو کم از کم اہمیت دیتا ہے ۔ محنت اور سرمائے کے امتزاج سے معاشی ڈھانچہ کی تشکیل کو وہ تسلیم کرتا ہے ۔ لیکن محض سرمائے کی بنیاد پر بغیر محنت کے کمائی کو وہ اچھا نہیں سمجھتا ۔ اس کے نزدیک اصل چیز محنت ہے سرمایہ نہیں مثلاً اس کی بدترین صورت یہ ہے کہ کسی کاروبار میں صرف سرمایہ لگانے والا شخص منافع میں تو شریک ہو لیکن نقصان میں حصہ دار نہ ہو اور منافع کی بھی معین شرح لینے پر مصر ہو تو یہ ایک انتہا پسندانہ سطح ہے ۔ جس میں سرمایہ محض سرمائے کی حیثیت سے کمائی کا حقدار بنا ۔ اس مثال سے چار امور

سامنے آتے ہیں۔

(۱) سرمایہ بحیثیت سرمایہ منافع کا مستحق ٹھہرا (۲) اپنے تحفظ کی ضمانت (۳) نقصان میں عدم شرکت (۴) نفع کی ایک متعین شرح۔

جہاں یہ چاروں صورتیں جمع ہوں تو یہ ربوا ہے۔ اور اسلام نے اپنے نظام معیشت میں اس کی جڑ کاٹ دی ہے۔ زنا، شراب غرض کسی برائی کے بارے میں قرآن مجید نے وہ سخت لہجہ اختیار نہیں کیا۔ جو ربوا کے بارے میں اختیار کیا ہے ربوا کے بارے میں اس کی آتش غضب یوں بھڑکتی ہے۔

یایھا الذین آمنوا اتقوا اللہ	اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور
وذروا ما بقی من الربوا	جو سود کہ کسی کے ذمہ ہے چھوڑ دو۔
ان کنتم مومنین ہ	ہاں اگر نہیں کروگے تو پھر اللہ اور
فان لم تفعلوا فاذنوا	اس کے رسول کے مقابلے میں جنگ
بحرب من اللہ ورسولہ [۱]	کے لئے تیار ہو جاؤ۔

اس قدر سخت وعید کسی اور معاملے میں نہیں آئی اور اس کی بہترین وضاحت اور ہماری ذہنی سطح کے مطابق بات قرآن کے مزاج شناس اور اللہ کے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی۔

الربوا سبعون جزءًا	ربوا کے ستر جزو ہیں اُن میں سے
ایسرھا ان ینکح الرجل	سب سے ہلکا یہ ہے کہ کوئی شخص
اُمّہٗ [۲]	اپنی ماں سے نکاح کرے۔

یہ انداز کھلتا ہے کہ حضورؐ نے ایسی تشبیہ کیوں اختیار فرمائی لیکن غور کریں تو اس کی حکمت روز روشن کی طرح ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ بعض چیزیں ایسی ہیں جن سے ہمیں طبعی طور پر نفرت ہے اور بعض چیزیں اس کے ہم پایہ برائی ہیں۔ لیکن ہم انہیں جبلی یا طبعی طور پر برائی نہیں سمجھتے جب کوئی شخص انہیں پہلی چیزوں کی طرح ہمارے سامنے لائے گا ان سے تشبیہ دے کر بیان کریگا تو حقیقت واضح ہوگی۔ یہی حکمت حضورؐ کے اس فرمان میں پوشیدہ ہے۔ تم شائد اسے جرم نہ سمجھو اور یہ کہہ کر خود کو مطمئن کر لو کہ سود لے لیا تو کونسی برائی ہوگئی یہ دراصل ماں سے نکاح

کرنے کے مترادف ہے گویا ہمارے نظام شریعت میں بدترین بُرائی ربوا قرار پاتی ہے۔
نظام سرمایہ داری میں سب سے زیادہ اہمیت ہی سرمائے اور اس کے تحفظ کو ہے اور اسلام نے اسے ربوا قرار دے کر اس کی جڑ ہی کاٹ دی ہے۔ اس کی دوسری صورت یہ ہے جس میں سرمایہ مارکیٹ کو کنٹرول کرتا ہے، اس کے اتار چڑھاؤ کا باعث بنتا ہے۔ ایک شخص دس لاکھ روپے سے اپنی مالی حیثیت کا تعین کراتا ہے اب وہ سٹہ کھیلتا ہے۔ زبانی کلامی ہی خریدا اور بیچ دیا۔ لیا اور دیا، صرف اپنی مالی حیثیت کی بنا پر مارکیٹ میں اتار چڑھاؤ پیدا کرتا ہے ورنہ حقیقت میں نہ کچھ لیتا ہے اور نہ دیتا ہے کبھی یکدم مال خرید کر قیمتیں چڑھا دیتا ہے اور کبھی مال ریلیز کر کے قیمتیں گھٹا دیتا ہے۔ یہ سب سرمائے کا کھیل ہے۔ سرمایہ منڈی سے کھیل رہا ہوتا ہے۔
کراچی سٹاک ایکسچینج میں یہ دلچسپ صورت حال دیکھی جا سکتی ہے کہ نظری طور پر سودے ہو رہے ہیں نہ کچھ لینا اور نہ کچھ دینا پاگلوں کی طرح چیخ پکار ہوتی ہے اور پھر سیٹھوں، ساہوکاروں کو اطلاع دینے کے لئے دوڑتے ہیں یہ منڈی کا اتار چڑھاؤ ہو رہا ہوتا ہے اور سرمایہ داروں کا کھیل۔ اسی ضمن میں انشورنس آتی ہے ان سب چیزوں کو اسلام نے حرام قرار دیا ہے۔ انشورنس میں دو پہلو ہیں جو حرمت لئے ہوئے ہیں ایک تو جوا ہے اور دوسرا سرمائے کے تحفظ کی ضمانت۔ اس بات کو ایک مثال سے سمجھیے۔

ایک شخص دس لاکھ روپے سے ماچس بنانے کا کارخانہ قائم کرتا ہے۔ اور دس لاکھ روپے کی انشورنس کراتا ہے اس کا سرمایہ آفات سماویہ کی زد میں ہے کوئی اتفاقی حادثہ، آگ یا سیلاب اس کارخانے کو تباہ کر سکتا ہے۔ لیکن وہ اپنے سرمائے کا تحفظ یوں کرتا ہے کہ اس کی انشورنس کراتا ہے اور دوسرا ظلم یہ کرتا ہے کہ یہ تحفظ اپنی جیب پر بوجھ ڈال کر حاصل نہیں کرتا بلکہ اس کا سالانہ پریمیم بھی جو وہ ادا کرتا ہے لاگت میں شمار کرتا ہے۔ ماچس کی ایک ڈبیہ پر وہ پریمیم کی لاگت ڈالتا ہے اور ضرورت مند سے اس کی قیمت وصول کرتا ہے۔ صرف اس لئے کہ اس کا سرمایہ محفوظ ہو جائے۔ کسی حادثے کی صورت میں جہاں تک اجتماعی مفاد کا تعلق ہے کہ ہمارا ایک ملک ایک قوم ہے جس کے مادی مفادات مشترکہ ہیں۔ تباہی تو آگئی اور دس لاکھ روپے کا سرمایہ ملکی سطح

پر ضائع ہوگیا۔ لیکن سرمایہ دار اس نقصان میں سے ایک پائی بھی برداشت کرنے کیلئے آمادہ نہیں اور خریدار کا خون چوس کر اپنے سرمائے کا تحفظ کرتا ہے یہ سرمایہ داروں کی امداد باہمی کا نظام ہے۔ جو اپنے سرمائے کا تحفظ کر رہے ہیں اس کی حرمت کا اسلام نے قطعی فیصلہ صادر کر دیا ہے۔ کی لا یکون دولۃ بین الاغنیا (۱)

ایک دائرہ اور بھی ہے جس میں بعض چیزیں حلال اور بعض حرام ہیں اور بعض وہ ہیں جنکی حلت و حرمت میں کچھ اختلاف پایا جاتا ہے۔ ان چیزوں کو ہم ایک ہی گروپ میں لاتے ہیں۔ ایک شخص محنت کر سکتا ہے۔ صحت مند اور محنتی ہے لیکن اس کے پاس سرمایہ موجود نہیں۔ اس کے برعکس ایک دوسرا شخص ہے جسکے پاس سرمایہ موجود ہے یہ دونوں مل کر کاروبار کرتے ہیں ایک شخص سرمایہ فراہم کرتا ہے اور دوسرا اس میں اپنی محنت شامل کرتا ہے۔ اس محنت اور سرمائے کے امتزاج کو مضاربت کہتے ہیں۔ یہ اسلام میں جائز ہے لیکن ناپسندیدہ نہیں جسطرح طلاق جائز ہے لیکن اللہ تعالےٰ کے نزدیک سب سے زیادہ ناپسندیدہ چیز۔ اسلام کا تقاضہ یہ ہے کہ جس کے پاس صرف اس قدر سرمایہ ہے کہ وہ اپنی ضرورت ہی پوری کر سکتا ہے تو وہ خود کاروبار کرے اور اپنی ضروریات پوری کرے لیکن اگر اس کے پاس کوئی دوسرا ذریعہ آمدنی موجود ہے مثلاً وہ ملازمت کرتا ہے تو اس کے پاس جو ضرورت سے زائد سرمایہ ہے۔ وہ اپنے مجبور بھائی کو دے دے۔ اور اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر اس کی محنت میں سے حصہ نہ بٹائے۔

مضاربت میں بھی یہ شرط رکھی گئی ہے کہ نقصان کا پورا بوجھ سرمائے پر پڑے گا اور محنت کش ایک پائی کے نقصان میں بھی شریک نہیں ہوگا۔ اسلام نے محنت کے تحفظ کو منافع کا جائز ذریعہ قرار دیا ہے۔ اس صورت میں وہی مضاربت جائز ہوگی جس میں نقصان کی پوری ذمہ داری سرمایہ فراہم کرنے والا شخص برداشت کرے اور منافع میں وہ محنت کش کے برابر ہو لیکن یہ وضاحت دوبارہ کر لی جائے کہ اسلام کے نزدیک یہ عمل بھی پسندیدہ نہیں۔ اس کا پسندیدہ طریقہ یہ ہے کہ اصل زائد سرمایہ رکھنے والا محض یہ سرمایہ کسی دوسرے ضرورت مند مسلمان بھائی کو بطور قرض حسنہ دے تاکہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکے۔ اور اس کی خوشحالی، قومی خوشحالی میں حصہ دار بنے اس سے اجتماعی زندگی میں حسن پیدا ہوگا۔

اگر آپس کے معاملات مجبوری میں طے پائیں تو یہ حسن کہاں پیدا ہو گا قرآن مجید بیع کو بھی باہمی رضامندی سے مشروط کرتا ہے ۔

عن تراض منکم ؕ یعنی تمہاری رضامندی سے ۔

مثال کے طور پر آپ کو ایک جوتا خریدنا ہے آپ مارکیٹ میں گھومیں پھریں آپ کو اندازہ ہے کہ اس وقت ایک معیاری جوتے کی قیمت سو سوا سو روپے ہے آپ جب خریدتے ہیں تو اس میں کسی مجبوری کو دخل نہیں ہوتا ۔ آپ سمجھتے ہیں کہ اس وقت لاگت اس قدر ہے ، اس پر منافع کی شرح اندازاً یہ ہو گی یہ باہمی رضامندی کا سودا ہے لیکن کوئی ایسا معاملہ جس میں کوئی شخص کسی مجبوری کے تحت ایسا کر رہا ہو چاہے قانوناً یہ بات جائز ہو گئی کہ سرمایہ رکھنے والا شخص کہہ سکتا ہے صاحب ، وہ میرے پاس اپنی خوشی سے آیا ہے اور سرمایہ لے کر کاروبار کرنے کی صورت میں اس کے منافع میں مجھے شریک کرنے کی پیشکش کرتا ہے ۔ اس میں کسی مجبوری کو کوئی دخل نہیں ۔ کہنے کو تو یہ بات ہے لیکن حقیقتاً مجبوری کو اس میں دخل ہے ۔ اگر اس کے پاس سرمایہ موجود ہو تو وہ کسی کو اپنی خون پسینے کی کمائی میں کیوں شریک کرے گا ۔ یہ مضاربت کی وہ شکل ہے جو حلال ہے لیکن اسلام اسے پسند نہیں کرتا ۔

مزارعت

اس قبیل کی ایک چیز مزارعت بھی ہے ایک شخص کی زمین ہے دوسرا اس پر محنت کرتا اس کی پیداوار میں زمیندار کو شریک کرتا ہے ۔ صنعتی انقلاب کے بعد مشین اور دوسری چیزوں یا معدنیات بھی ذرائع پیداوار میں شامل ہو گئیں لیکن قدیم ترین ذریعۂ پیداوار زمین ہی ہے اور زمین کے بارے میں بقول علامہ اقبالؒ اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے ۔

رزق خود را از زمیں بردن رواست
ایں متاع بندہ و ملک خداست

مزارعت کے بارے میں ہمارے ہاں اختلاف ہے ۔ امام ابوحنیفہ اسے حرام مطلق کہتے ہیں ۔ وہ کسی نوع کی مزارعت اور غیر حاضر زمینداری کو جائز نہیں سمجھتے ۔ دوسرے فقہائے نے احادیث پر ذرا غور کر کے کچھ ایسے پہلو نکالے ہیں ۔ جن سے کچھ

گنجائش پیدا ہوتی ہے۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ وہ اُس دور کے خاص حالات تھے۔ مصالح مرسلہ یا استحسان کے اصول کے تحت ایسی گنجائش نکالی گئی ورنہ حضور نے مزارعت پر لفظ ربوا استعمال کیا ہے۔ حضرت رافع بن خبیب کے بارے میں حضورؐ کو معلوم تھا کہ ان کے پاس کوئی زمین نہیں ہے آپ مدینہ منورہ سے باہر کہیں جا رہے تھے۔ دیکھا کہ رافع کھیت کے پاس کھڑے ہیں پوچھا تم یہاں کیسے ؟ انہوں نے عرض کیا زمین فلاں کی ہے میں نے محنت کی ہے اور میرے اور اس کے مابین یہ شرح معین ہو گئی ہے تو حضور نے فرمایا۔ قدار بتما (تم نے ربوا کا معاملہ کیا ہے) یہ زمین لوٹا دو جو کچھ اس پر تمہارا خرچ ہوا ہے وہ تم لے لو اس لئے کہ اس زمین میں اس کی کونسی محنت شامل ہے جس کا وہ معاوضہ لے رہا ہے۔ صرف اس وجہ سے کہ زمین کا مالک ہے۔ وہ اپنے بھائی کی گاڑھے پسینے کی کمائی سے حصہ وصول کر رہا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ کا یہ فتویٰ آنکھیں کھول دینے والا ہے اور ہمیں اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ویسے تو یہاں ملک کی نوے فیصد آبادی حنفیوں پر مشتمل ہے۔ لیکن ایسے ایسے اہم معاملات میں امام ابوحنیفہ کا فتویٰ کوئی ماننے کے لئے تیار نہیں یا تو انہیں امام اعظم کہا اور مانا جاتا ہے۔ اور سید الفقہا بھی۔ لیکن جہاں ان کا فتویٰ اچھا نہیں لگتا اسے اٹھا پھینکنے اور دیوار پر دے مارنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوتی۔ یہ ہماری دوعملی ہے جس پر ہمیں غور کرنا چاہیئے مضاربت اور مزارعت کو ہم نے تیسرے درجے میں رکھا ہے۔

اب آیئے چوتھی صورت کی طرف اسلام میں جو مال موجود نہ ہو اس کے بیع کی جو شکل بھی ہو گی حرام ہو گی۔ یہ جتنے ایڈوانس سودے ہو رہے ہیں یہ تمام معاملات جس میں سرمایہ کھیلتا ہے ان سب کے دروازے بند کر دیئے گئے ہیں۔ بیع وہ ہے کہ مال موجود ہے اور قیمت ادا کر دی گئی یا دو چیزیں ہیں جن کا تبادلہ ہو گیا ایک ہاتھ سے دیا دوسرے سے لیا۔ یہ بیع ہے اور اس میں بھی (عن تراض منکم) باہمی رضامندی ضروری ہے اگر مجبوری سے فائدہ اٹھایا گیا ہے اگر کہیں مصنوعی قلت کے ذریعے سے ریٹ بڑھا دیئے گئے ہیں اگر کہیں کوئی اور کھیل کھیلا گیا ہے تو اس میں حرمت کا پہلو شامل ہو جائے گا۔ ہمارے ہاں جو سودے بازی ہوتی ہے۔ زمین آپ نے ٹھیکے پر دی ہے اب چاہے کسان کو کچھ بچے نہ بچے آپ کا ٹھیکہ محفوظ ہے۔

باغ میں ابھی پھل نہیں آیا اس کا سودا ہوگیا ہے۔ یہ سب حرام مطلق ہے۔ ہمارے دین میں ان کی کوئی گنجائش نہیں۔ ادھار کی شکل میں صرف ایک سودا جائز ہے۔ جسے بیع سلم کہتے ہیں۔ دو چیزوں کا بالکل تعین ہو جائے اور ان میں سے ایک چیز کا ملائے دی جائے۔ یہ بیع سلم ہے۔ ہمارے ہاں یہ ہوتا ہے کہ فلاں چیز فلاں وقت لے لونگا۔ اور یہ بیعانہ لے لیجئے۔ اگر وقت پر وہ چیز نہ دے سکا تو بیعانہ ہضم۔ اب یہ بیعانہ کس کھاتے میں ہضم ہو رہا ہے۔ وہ سودا تو پورا ہو نہیں پایا۔ یہ ساری چیزیں درحقیقت اس وجہ سے ہمارے ہاں رواج پا گئی ہیں کہ ہمارے ہاں شریعت کوئی ہیئت حاکمہ کی حیثیت سے ہے ہی نہیں۔ مارکیٹ میں جو رواج چلا وہ ہم نے اختیار کر لیا۔

اوورٹریڈنگ ایک شخص کے پاس پانچ لاکھ روپے ہیں وہ اوورٹریڈنگ میں پچاس لاکھ روپے کا مال لے لیتا ہے اسے ناجائز قرار دیا گیا ہے۔ اگر آپ کے پاس پانچ لاکھ ہیں تو پانچ لاکھ کا سودا کر لیجئے۔ پانچ لاکھ اس وقت آپ کو دیدینا ہوگا۔ اس ادائیگی کو بیع سلم کہتے ہیں۔ بیع کے ضمن میں بھی حدود قائم کر دی گئی ہیں۔ اور ان سب کا مقصد یہی ہے کہ سرمائے کو زیادہ کھل کھیلنے کا موقع نہ ملے اسی سلسلے میں میری زندگی کا ایک یادگار واقعہ ہے۔ اسی لاہور کے ایک بڑے دارالعلوم میں ایک صاحب سے ملنے گیا۔ عالم دین ہیں، شیخ الحدیث ہیں، حدیث کا درس دے رہے تھے میں بھی بیٹھ گیا مشکوٰۃ شریف میں ایک حدیث ہے۔ جو کئی طرق سے آئی ہے۔ متن وہی ہے طریقے مختلف ہیں۔

لا یبیع الحاضر للبادی ۔ کوئی کسی جگہ کا رہنے والا شخص باہر سے آنے والے مال کو فروخت نہ کرے۔ درس مکمل ہوگیا۔ موجودہ کاروبار کے بارے میں کوئی ریفرنس نہ آیا۔ ہمارے معاشرے میں بیع و شرا کے جو طریقے رائج ہیں اس پر کوئی بحث نہ ہوئی میں نے سوال کیا حضرت! ہمارے ہاں جو آڑھت کا کاروبار ہوتا ہے۔ اس حدیث کی روشنی میں اس کا کیا حکم ہے۔ شیخ الحدیث نے جو جواب دیا وہ آپ بھی سنیئے اور تعجب بھی کیجئے۔ انہوں نے مجھ سے سوال کیا آڑھت کیا ہوتی ہے؟ اب یہ تجاہل عارفانہ تھا یا فی الواقع انہیں معلوم نہیں تھا۔ بہرحال میں تو نیت کا فیصلہ نہیں کر سکتا۔ لیکن اس دور میں شہر لاہور میں ایک شیخ الحدیث جانتے نہ ہوں کہ آڑھت کیا ہوتی ہے یہ

بات بہرحال بظاہر قابل قبول نہیں ہے۔ میں نے جب تشریح کی کہ یہاں کچھ لوگ دکانیں بنا کر بیٹھے ہیں، منڈی ہوتی ہے۔ ان کا اڈہ ہوتا ہے باہر سے لوگ جنہوں نے کاشت کی ہے اناج اور سبزیاں لے کر آتے ہیں۔ مختلف منڈیاں ہیں وہ ان کا مال فروخت کرتے ہیں۔ منڈی والے کمیشن لیتے ہیں۔ ان کا جواب تھا "یہ تو مطلقاً حرام ہے" اب اندازہ کیجئے کہ اس فیصلے کا یہی اطلاق ہے اس میں بھی لوگوں نے حلال کے بہت سے پہلو نکال لیے کہ آڑھت کی وہ شکل یہی ہے لیکن اگر ایک طرفہ کمیشن لیا جائے تو وہ حرام نہیں ہو گا۔ اس لئے کہ دوسری شکل ہو جاتی ہے گویا کہ وہ خریدار کی طرف سے وکیل بن گیا۔ جو وکالت کر کے اس کی طرف سے مال کا خریدار ہے اس طرح وہ اپنی اس وکالت کی اجرت لے رہا ہے۔ جس میں اس کیلئے حلت کا پہلو شامل ہو گیا ہے۔ اس تاویل میں بھی کسی بدنیتی کو دخل نہیں لیکن میں عرض کروں گا کہ جو چیز زمانے میں رواج پا جائے ہمارے ہاں فقہا نے اصول ایسے بنائے ہیں کہ جو عموم بلوی ہو کوئی چیز عام ہو گئی ہو یا زمانے کا ایک خاص نظم ہے اب اس کو بالکل ختم کرنا ممکن نہ ہو تو مصالح مرسلہ کہہ لیں یا استحسان، ایسی چیزوں کے بارے میں فقہا نے لوگوں کی آسانی کے لئے گنجائش پیدا کی ہے۔ تو بہرحال اس کے اندر جو حلت کا پہلو نکالا گیا ہے وہ یہ ہے کہ دوطرفہ آڑھت کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ حرام مطلق ہے لیکن ہمارے ہاں اجناس سبزیوں اور گوشت کا جو کاروبار ہوتا ہے وہ اس دوطرفہ آڑھت کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ مثلاً گوشت کی قیمتوں کو کنٹرول کرنے کی کوشش ہوتی ہے تو قصائی لوگ شور مچاتے ہیں کہ ساری مصیبت ان آڑھتیوں کی ڈالی ہوئی ہے۔ جو اصل منہگائی کا باعث ہیں۔ اس میں خرابی درخرابی یہ ہے کہ آڑھتی اپنا سرمایہ ایڈوانس کرتا ہے اور وہ ایڈوانس کر کے پابند کرتا ہے کہ اپنا مال یہاں میرے پاس ہی فروخت کرو گے۔ یہ خالص ربوا ہے کہ اگر کسی نے کوئی رقم کس کو دی اور اس رقم سے چاہے کوئی گن کر نقد معاوضہ نہیں لیا لیکن دوسرے کو اس کا پابند کیا وہ اپنا مال میرے پاس فروخت کرے گا۔ یہ درحقیقت ربوا ہے۔ یہ گندگی ہے یہ درحقیقت ظلمات بعضها فوق بعض ہے۔ بیع کے بارے میں ان حدود و قیود کا مرکزی نقطہ یہ

ہے کہ اسلام نے اپنے فقہی و قانونی نظام میں بھی ایسے اقدامات کیئے ہیں کہ سرمائے کو زیادہ کھل کھیلنے کا موقع نہ ملے۔

رومن امپائر کے عہد میں کرنسی ایجاد ہوتی ہے۔ انسان کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کتنی بڑی مصیبت اپنے سر مسلط کر رہا ہے۔ جب تک یہ کرنسی کا تصور نہیں تھا دنیا میں لین دین ہو رہے تھے۔ لیکن تبادلے کی بنیاد پر تھے اجناس کا تبادلہ تھا ایک شخص نے کھیت میں کام کیا ہے اس نے فصل پیدا کی دوسرا شخص کرگھے پر بیٹھا ہوا کھدر بنا رہا ہے۔ دونوں اپنی ضرورت کے مطابق تبادلہ کر لیتے۔ اس میں ہولڈنگ نہیں ہوتی وہ کتنی گندم اکھٹی کرے گا۔ لیکن جب سونے کو معین کر دیا گیا کہ ایک تولہ سونا مساوی ہے اتنے گز کپڑے کے، ایک تولہ سونا مساوی ہے اتنے من گندم کے۔ کرنسی کی لعنت درمیان میں آئی اب سرمایہ داری کا آغاز ہوا۔ آپ نے اپنی تجوری میں فرض کیجیے دس سیر سونا رکھا ہوا ہے۔ آپ کو موقع مل گیا آپ جس طرح چاہیں مارکیٹ سے کھیلیں جس طرح چاہیں اس کو اونچا نیچا کر لیں جس طرح چاہیں کنٹرول کریں یہ اس سرمائے کی، لعنت ہے جس میں اصل چیز کرنسی ہے۔ اس کرنسی نے یہ سارے امکانات پیدا کیئے۔ سرمائے کی اپنی ایک فارم ہے جب کہ آج کل کی اصطلاح میں مکان اور انسانی محنت بھی سرمایہ ہے۔ لیکن انسان کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑنے والی فارم کرنسی ہے لہٰذا اس کرنسی نے یہ ساری مصیبتیں انسان پر لادی ہیں۔ ورنہ انسانی ضرورت آپس کے تبادلے سے پوری ہو سکتیں ہیں۔ اس میں خواہ مخواہ تعریف کا پہلو تلاش نہ کیا جائے تو یہ ایک حقیقت ہے کہ:۔ اشتراکی ممالک میں اس وقت جو معاشی نظام ہے۔ وہاں کمیونزم میں زیادہ تر معاملہ اس تبادلہ سسٹم سے ہوتا ہے وہ اپنی ساری معاشی ضروریات آپس کے تبادلے سے پوری کرتے ہیں۔ اور کرنسی کا عمل دخل کم سے کم ہے۔

انسان ٹھوکریں کھا کر وہاں پہنچ رہا ہے جہاں کریم آقا صلے اللہ علیہ وسلم نے اور اللہ تعالےٰ کی کتاب نے چودہ سو سال پہلے پہنچا دیا تھا۔ لا بیع الحاضر للبادی۔ ایک شخص نے گندم پیدا کی ہے وہ آکر خود بیچے اور اگر کسی کے پاس دس ہزار

روپیہ ہے وہ اس دس ہزار کی گندم خرید کر بیچے - لیکن اگر ایک شخص اڈہ بنا کر بیٹھ جائے اور اس اڈے کی بنا پر کماتا ہے تو یہ حرام ہے یہ حدود وہ ہیں جن سے سرمایہ کاری سرمایہ داری نہیں بنتی - سرمایہ کینسر بن کر مسلط نہیں ہوتا - اس کے علاوہ کچھ اضافی اقدامات ہیں جو کچھ بھی مرتکز ہو گیا ہے اسے تقسیم کرنے کے لئے، گردش میں لانے کے لئے وراثت کے احکام ہیں - اسلام کا رجحان ارتکاز دولت کی طرف نہیں بلکہ تقسیم کی طرف ہے - اور وراثت اس میں ایک اہم رول ادا کرتی ہے - اس طرح سے اس میں دو چیزیں مزید شامل کر لیجئے انسانی کمزوریوں کو ایکسپلائٹ کر کے کمانا - جنس انسانی کی بہت بڑی کمزوری ہے - اس کے اس جنسی جذبے کو مشتعل کر کے کمانا حرام مطلق قرار دیا گیا اور ہمارے ہاں فلم انڈسٹری کا کاروبار اس بنیاد پہ ہے اس لئے میں نے اس کو کمزوری کہا ہے قرآن مجید نے بھی شرمگاہ کیلئے لفظ فرج استعمال کیا ہے" اندیشے کی جگہ " فصیل میں جہاں دراڑیں پڑ جائیں - جس سے ایک غنیم کو اندر آنے کا موقع مل سکتا ہے - دشمن کو اندر گھسنے کا موقع مل سکتا ہے قرآن اس کو فرج سے تعبیر کرتا ہے - کہ انسانی شخصیت کی فصیل میں یہ سب سے بڑی اندیشے کی جگہ ہے - اس کا یہ کمزور پہلو ہے - یہاں سے اس پر بڑی جلدی حملہ کیا جا سکتا ہے - شراب کی حرمت، اور فحاشی کے کاروبار پر قدغن کے بعد انسان اگر دولت، دولت کے لئے کماتا ہے تو اس میں ایک بہت بڑا عنصر اس کی عیاشی کرنے کی خواہش ہوتا ہے لیکن اسلام نے عیاشی کے دروازے بند کر دیئے ہیں -

اب ایک انسان سرمائے کو لے کر کیا کرے گا - آخر وہ سرمایہ کاہے کے لئے ہے - اس طریقے سے سرمائے کے ساتھ اٹیچمنٹ کم کر دیا گیا ہے - اسلام نے سرمایہ داری پر مختلف پہلوؤں اور اطراف سے حملے کیئے ہیں اور ان سب کا حاصل یہ ہے کہ اس نے اپنے قانونی نظام میں پرائیوٹ اونرشپ کی صورت بھی برقرار رکھی ہے - ذاتی دلچسپی کو بروئے کار لانے کا موقع دیا ہے - کھلا بھی چھوڑ دیا ہے محنت کرو کوشش کرو بھاگ دوڑ کرو، کھیت میں خوب محنت سے ہل چلاؤ، پسینہ بہاؤ - جو کچھ نکلے گا تمہارا ہے اس پر کوئی ظلم اور جبر کے ساتھ قبضہ

نہیں کر سکے گا۔ اس میں سے جو حق معین ہے وہ دے دو۔ اس حق معین کے ذریعے تو کفالت عامہ کا بندوبست ہو گیا کہ HAVE اور HAVE NOT کی تقسیم زیادہ نہ بڑھنے پائے۔ اور کوئی بھی بنیادی ضروریات سے محروم نہ رہ جائے۔ یہ وہ نکتہ عدل ہے کہ آزادی بھی برقرار رہے اور مساوات بھی۔ اسکے علاوہ اسلام کے نظام میں یہ گنجائش بھی ہے۔ کہ اگر کسی موقع پر زکواۃ اور عشر کے ذریعے سے حاصل شدہ رقوم یا کفالت عامہ کی ضروریات پوری نہیں ہوتیں۔ تو جبری ٹیکس وصول کرنے کا اختیار ہے۔ یعنی حق ملکیت کو بھی کسی طرح کا تقدس عطا نہیں کیا گیا۔ جو کسی سرمایہ دارانہ نظام میں ہوتا ہے۔ بلکہ وہاں اس ریاست کو جو غربا اور مساکین کی کفیل ہے یہ حق حاصل ہے کہ اگر اس کی ضروریات کسی وقت اتنی بڑھ جائیں یا کوئی امیر جنسی کی صورت ہو مثلاً جنگ شروع ہو گئی، قحط نے آلیا۔ اور صرف زکواۃ اور عشر سے کفالت عامہ کے تقاضے پورے نہیں ہوتے تو حکومت مزید بھی لے سکتی ہے۔ دوسری طرف اگر کسی کاروبار کو پبلک سیکٹر میں دینے سے عدل کے تقاضے پورے نہیں ہوتے ریاست کو نیشنلائزیشن کی اجازت بھی ہے۔ کیونکہ اصل قدر عدل ہے۔ مثلاً اجارہ داری ہے۔ کسی چیز کا صرف ایک ہی کارخانہ ہے۔ اب مالک کے لئے یہ موقع ہے کہ وہ جو قیمت چاہے وصول کرے اور لوگ لینے پر مجبور ہیں۔ اس صورت میں چونکہ تقاضۂ عدل پورا نہیں ہوتا۔ اس صنعت کو قومی ملکیت میں لینے کی پوری پوری آزادی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں عراق کی زمینیں فتح ہوئی ہیں (یہ بات آپ کے ذہن میں رہنی چاہیئے کہ عراق اور شام کا علاقہ انتہائی زرخیز ہے) فتوحات کے بعد مطالبہ کیا گیا کہ یہ زمینیں فوج میں تقسیم کر دی جائیں، اس لئے کہ یہ مال غنیمت ہے۔ اس پر تنازعے کی صورت پیدا ہوئی دونوں طرف سے دلائل دیئے گئے تو حضرت عمر کی اجتہادی بصیرت نے فیصلہ دیا کہ اس طرح عدل کے تقاضے پورے نہیں ہونگے۔ اس لئے یہ سب ریاست کی ملکیت ہونگی۔ اور اس پر کام کرنے والے موروثی مالکان کی حیثیت سے کام کرتے رہیں گے۔ البتہ اسلامی ریاست لگان وصول کرے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ

اگر یہ فیصلہ نہ فرماتے تو اسلام کے ذریعے دنیا میں بدترین جاگیرداری نظام رائج ہوجاتا کیونکہ ان فوجیوں کی تعداد چند ہزار سے زیادہ نہ تھی قانون کے ڈھانچے میں بھی غربا کی مصلحت کو پیش نظر رکھا گیا ۔ بجائے سرمائے کے محنت کو اتنا تحفظ دیا کیا کہ اگر کہیں نکتہ عدل بحال نہ رہے تو اسے نجی ملکیت سے نکال کر قومی تحویل میں لے لیا جائے ۔ اس کے لئے کوئی رکاوٹ نہیں حضرت عمرؓ کا اجتہاد چمکتا ہوا سورج ہے ۔ اسلامی ریاست میں دونوں نظام علیحدہ علیحدہ نہیں ہوتے ۔ یہ بیک وقت ہوتے ہیں اور اسلام کی برکات کا ظہور صرف قانونی نظام سے نہیں ہو پائے گا ۔ جب تک کہ معاشرے میں کچھ لوگ ایسے موجود نہ ہوں جو ایمانی اور رُوحانی سطح پر زندگی بسر کریں کیونکہ معاشرے کی اقدار کو کنٹرول یہی لوگ کرتے ہیں ۔ ہمارے معاشرے میں اصل قدر دولت اور سرمایہ ہے جس کے پاس دولت اور سرمایہ ہے اسے بڑے سے بڑا شخص جھک کر ملے گا ۔ لیکن رُوحانیت کے علمبرداروں کے ہاں یہ بات نہیں ۔ وہ گودڑی پوش سُلطان الہند نظام الدین اولیا جو درویش ہیں اور گویا کہ اسلام کی ایمانی تعلیمات کا مظہر اتم منظر کامل ہیں ۔ انہیں دنیا کی کسی شے سے رغبت نہیں وہ دنیا کی کسی چیز کی ملکیت اختیار کر کے فخر کرنے والے نہیں ۔ دن بھر کی ضرورت کے لئے دال روٹی اور ایک چھت سر چھپانے کے لئے ہے تو بس اس سے زیادہ کسی مزید چیز کے حصول کی خواہش نہیں ۔ مال و زر کے انبار انہیں قطعاً متاثر نہیں کرتے ۔ جب تک کہ معاشرے میں ایسے لوگ موجود نہ ہوں جو اس اعلیٰ سطح پر زندگی بسر کرتے ہوں ۔ اور وہ آیت ویسئلونك ماذا ینفقون ، قل العفو کا نمونہ نہ بن جائیں ۔ معاشرے کی قانونی اقدامات سے اصلاح نہیں ہوسکتی ۔ اس لئے معاشرے میں ایک طبقہ ایسا موجود رہنا چاہیئے ۔ جس سے معاشرے میں اقدار کا تعین ہوتا ہے ، جس سے وہ ایمانی حقیقت سامنے رہتی ہے ۔ کہ اصل مسئلہ معاش کا نہیں معاد کا ہے ۔ اصل چیز دولت نہیں ، نیکی ہے ۔ عمل صالح ہے ، اللہ کا نام ہے اور اس کے رسول کا اتباع اور ان کی محبت ہے یہ اقدار اگر معاشرے میں روشنی کے یہ مینار بالفعل موجود نہ ہوں تو اسلام کی برکات کا کامل ظہور

کبھی نہیں ہو سکتا۔ اس بات کو ایک ناگزیر ضرورت کی حیثیت سے سامنے رکھیئے۔ کہ یہ نقشہ بھی معاشرے میں موجود رہنا چاہیئے۔ ابوذر غفاری موجود رہنے چاہیں۔ اور ابوذر غفاری تو ایک انتہا کو پہنچ گئے تھے۔ وہ فقرا صحابہ (اصحاب صفہ) جو معاشرے کے اندر موجود تھے انتہائی مسکین روکھی سوکھی کھانے والے۔ جنہوں نے سب کچھ اللہ اور اس کے رسول کی راہ میں دے دیا تھا۔ حضرت ابو الدرداء مقداد حضرت انس بن مالک وغیرہ ایسوں کے متعلق ہی حضورؐ نے فرمایا کہ کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں کہ چہرے غبار آلود۔ لیکن اللہ کے ہاں ان کا مقام یہ ہے کہ اگر کسی بات پر خدا کی قسم کھا بیٹھیں تو خدا تعالےٰ ان کی قسموں کی لاج رکھے گا یہ ہے ہمارے روحانی نظام کا ایک نقشہ۔ اگر یہ موجود نہ ہو تو قانونی نظام ہمارے مسائل کا حل نہیں۔ حضورؐ نے فرمایا جس نے مکہ کی زمین کا کرایہ لیا اس نے سود کھایا کیونکہ لوگ حج کی ادائیگی کے لئے مکہ آنے پر مجبور ہیں۔ اب یہاں کے پروہت اور پنڈت ہزار ہزار روپے ایک چھوٹے سے کمرے کے چند دنوں کے لئے وصول کرتے ہیں۔ اور یہ سارا ان کے نزدیک حلال ہے اور عیش کرتے ہیں اس کا نتیجہ یہی نکلتا ہے۔ کہ یہ ساری دولت پہلے بیروت میں عیاشیوں اور فحاشیوں پر خرچ ہوتی تھی۔ اب لندن، پیرس اور امریکہ میں خرچ ہوتی ہے۔

اگر صرف قانونی حیلہ بازیوں پر اکتفا کیا جائے تو یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے اس لئے قانونی اور روحانی نظام کے حسین امتزاج سے ہی اسلام کا معاشی نظام ترتیب پاتا ہے۔ اور جہاں دوئی یکجائی ہو تب کسی نظام کو اسلام کا معاشی نظام کہا جا سکتا ہے۔ یہ ہیں چند نکات جن کی روشنی میں ایک اسلامی فلاحی معاشرہ قائم کیا جا سکتا ہے۔

ع گر یہ نہیں تو بابا سب کچھ کہانیاں ہیں۔

جمعرات کی شام کو ٹاؤن ہال لاہور میں بیٹھے ہوئے مجھے یہ واقعہ اس وقت معاً یاد آیا جب کہ ڈاکٹر اسرار احمد اپنی تقریر میں جس کی اڑان میں مجدد الف ثانیؒ سے لے کر دورِ حاضرہ کی تمام قابل شخصیات سمٹ آئی تھیں "تنظیم اسلامی" کے عنوان پر علوم و معارف کے دریا بہا رہے تھے۔ کم و بیش تین گھنٹے کی اس تقریر میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب بلا لومۃ لائم احیائے دین کے لئے برصغیر کی تحریکوں پر عموماً اور پاکستان میں خصوصاً جس بے ساختگی، گھن گرج، تڑپ اور جوش سے تبصرہ کیا، اس پر اقبالؔ کا یہ مصرع میرے شعور کی پہنائیوں میں دھڑکن پیدا کرتا رہا

ع: "ایک بلبل ہے کہ ہے محوِ ترنم اب تک!"

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے مجدد الف ثانیؒ، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ، امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد، علامہ اقبال، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا امین احسن اصلاحی تک احیائے دین کے لئے ان سے متعلق تمام دھاروں کو نقطۂ عروج پر لاتے ہوئے آج پاکستان میں غلبہ اور اقامتِ دین کے لئے تاریخی لحاظ سے ہر ایک شخص کو کمربستہ ہونے کی دعوت دی۔ چونکہ ڈاکٹر صاحب اُمت کی تاریخ پر گہری نظری رکھتے ہیں اور چونکہ وہ طب کے ڈگری یافتہ بھی ہیں، اس لئے انہوں نے ماموریت کے مقام سے نہیں بلکہ ایک مُناد کی حیثیت میں ہر شخص کو بقدر استطاعت اس مہتم بالشان مہم یعنی تحریک اقامتِ دین میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ انہوں نے ہر سننے والے پر یہ تاثر راسخ کرنے کی کوشش کی کہ اسلام کو خدا کے منشاء کے مطابق تمام ادیان پر غالب کرنے کے لئے جس میں دُنیا کی بھی بھلائی ہے۔ پاکستان کے ایک ایک مسلمان کو فرقہ بندی سے الگ رہ کر قرآن کی تعلیم کو اپنی زندگی کا نمونہ بنانا چاہیئے۔ اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس احساس سے سرشار لوگ ایک نظام میں منسلک ہو کر اپنے آپ کو قرآن کی تعلیم اور اس کی تبلیغ کے لئے وقف کر دیں۔

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نہ تو واعظ ہیں اور نہ ہی وہ "کمرشل" ہیں بلکہ وہ ایک ایسے انسان ہیں جنہوں نے دُنیا کی متاع پر لات مار کر اپنی عاقبت سنوارنے کے لئے اپنے دل سے ایک فیصلہ کر رکھا ہے۔ وہ اس دھن میں مست دن رات،

صبح و شام، سردی اور گرمی، آرام اور بے آرامی، تحسین اور تردید سب کچھ سے بے نیاز ہو کر قرآن کے نور کو ہر سطح پر پھیلانے میں مصروف ہیں - انہیں اپنی علمیت پر کوئی ناز نہیں - انہیں کسی قسم کی ٹھیکے داری اور اجارہ داری سے غرض نہیں - وہ اپنے جنون، اپنے عشق اور وارفتگی میں اُمت کے تمام طبقوں اور فرقوں کو قرآن عظیم کے پیغام پر متحد اور مستفیض ہونے کے لئے کام کئے جاتے ہیں اور ہر اس شخص کا جو اس مقصد سے لگاؤ رکھتا ہو، کھلے دل سے خیر مقدم کرتے ہیں - اُن کا لباس، اُن کی خوراک اور اُن کی رہائش ویسی ہی ہے جیسی کہ پاکستان کے کسی متوسط درجے کے فرد کی حاصل ہو - ان کی آواز میں اثر ہے، ان کی شخصیت میں کشش ہے، ان کی آنکھوں میں چمک ہے، وہ جناح ہال میں تین گھنٹے تک بلا تکان، بلا تکلف اپنی کہتے چلے گئے - نہ تو ان کا گلا بیٹھا اور نہ اُن پر تھکان کے کوئی آثار نمودار ہوئے اور جب جلسے کے اختتام پر انہوں نے نماز عشاء میں امامت کرتے ہوئے قرأت کی تو مقتدیوں کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو ٹپک پڑے

ہیں یہ احساس نہیں کہ یورپ اور امریکہ عیسائیت کی تبلیغ کے لئے کیا کچھ کر رہے ہیں - وہاں پوپ سے لے کر بلی گراہم تک لاکھوں کی تعداد میں عیسائی مبلغین اپنے آپ کو عیسائیت کی تبلیغ کے لئے وقف کر چکے ہیں - کہنے کو تو یورپ اور امریکہ سیکولر ہیں لیکن اس سیکولرزم کے پردے میں مغربی ممالک

کی حکومتیں تثلیث کی اشاعت کے لئے مسلمانوں سے کہیں بڑھ چڑھ کر کام کر رہی ہیں - انہوں نے اپنے فقہی اختلافات کو ترک کر کے اسلام کا مقابلہ کرنے کے لئے حیرت انگیز نظام مرتب کر لیا - اگر ہم فی الحال اپنے فقہی اختلافات کو ترک کر کے فرقہ واریت کو دفن نہیں کر سکتے تو ہمیں کم از کم رواداری سے کام لیتے ہوئے لوگوں کو اپنی اپنی صوابدید اور ذرائع کے مطابق اپنے اپنے میدان میں کام کرنے کی دل سے اجازت دینا چاہیئے - میرے خیال میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اس ضرورت کی جیتی جاگتی تعبیر اور تفسیر ہیں - ان کے نمونہ پر اگر کام کیا جائے تو مسلم معاشرہ فرقہ واریت کی تلخیوں سے محفوظ ہو سکتا ہے ۔

قرآن کا دستورِ اساسی

علامہ محمد تقی امینی

"دستورِ اساسی" سے مراد وہ اصول و ضوابط اور قانونی تشریحات ہیں جن کے مطابق زندگی کی تعمیر ہوتی، حکومت کی تشکیل ہوتی اور اس کا انتظام چلایا جاتا ہے۔ قرآن حکیم اصلاً اصول و ضوابط ہی کی کتاب ہے، قانونی تشریحات اس میں بہت کم ہیں لیکن جس قدر بھی ہیں وہ بطورِ "نمونہ" اصول و ضوابط سے حاصل کردہ ہیں تاکہ ان کی روشنی میں نمو پذیر زندگی اور ترقی پذیر معاشرہ کی رہنمائی کے لئے مزید قوانین حاصل کئے جاتے ہیں۔

یہ طریق کار اس "دستور" کے لئے ناگزیر ہے جس کی حیثیت دوامی اور عالمگیر ہو کیونکہ بیک وقت اگر زندگی و معاشرہ سے متعلق قانون کی تفصیل بیان کر دی جاتی یا حکومت کی عملی تشکیل کا خاکہ تیار کر دیا جاتا تو وہ ایک دور اور زمانہ کے ساتھ مخصوص اور محدود ہو کر رہ جاتا اور اس میں وہ جامعیت و جاذبیت نہ پیدا ہوتی جو نمو پذیر زندگی اور ترقی پذیر معاشرہ کی رہنمائی کے لئے درکار ہے۔

"دستور" سے مزید قوانین حاصل کرنے کے لئے دو قسم کے شعور کی ضرورت ہے۔ (۱) شعورِ نبوّت اور (۲) شعورِ اجتہاد ——!!

شعورِ نبوّت سے مراد علم و حکمت کا نور اور فہم و ادراک کا وہ کمال ہے جو نبوّت کے خلقی وجدان و داخلی شعور کا نتیجہ اور فیضانِ الٰہی کا ذریعہ ہے۔ شعورِ اجتہاد سے مراد علم و فہم کی وہ سطح یا ذہن و فکر کی وہ رسائی ہے جو عقلی بصارت و قلبی بصیرت کا نتیجہ اور اخذ و استنباط کی صلاحیت کا ذریعہ ہے۔

ختمِ نبوّت پر شعورِ نبوّت کا سلسلہ ختم ہو گیا لیکن یہ اس وقت ختم ہوا جبکہ شعورِ اجتہاد اس کی قائم مقامی کے قابل بن گیا۔ یعنی اس میں اس درجہ پختگی، توانائی اور خود اعتمادی پیدا

ہو گئی کہ زندگی و معاشرہ کے مسائل حل کرنے کے لئے اس کو بار بار آسمان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کی ضرورت نہ رہ گئی (جیسا کہ ختمِ نبوّت سے قبل رسول اور نبی کے ذریعے آسمانی ہدایت کا انتظار رہتا تھا) بلکہ وہ خود تلاش و جستجو اور غور و فکر سے یہ مسائل حل کرنے لگا۔

لیکن زندگی و معاشرہ کا تجربہ رکھنے والے ماہرین و مفکّرین اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ شعورِ عقلی بصارت اور قلبی بصیرت کے فیصلے اور نتائج بشری خصوصیات اور کمزوریوں سے خالص اور بے آمیز نہیں ہوتے بلکہ طبعی حجابات اور وضعی حالات ان دونوں میں اس قدر پیوست ہیں کہ کلی طور پر ان کو کسی وقت جدا نہیں کیا جا سکتا۔ ایسی حالت میں لازمی طور سے شعورِ اجتہاد (جس کی تکوین میں دونوں کی آمیزش ہے) کے فیصلے اور نتائج نہ بالکلیہ خالص و بے آمیز ہوں گے۔ اور نہ زندگی و معاشرہ کے مسائل حل کرنے کے لئے اس کو آزاد و خود مختار چھوڑنے کی اجازت ہو گی۔ بلکہ ہر موڑ اور ہر موقف پر اس کے لئے بلند و برتر رہنما کی تلاش اور ضرورت ہو گی کہ جس کی رہنمائی میں حتیّ المقدور اپنے فیصلے اور نتائج میں نکھار پیدا کر سکے اور جس کا دامنِ عصمت اس کی تردامنی کے لئے ذریعۂ نجات بن سکے!

یہ رہنما شعورِ نبوّت ہے کہ انسانوں کی دُنیا میں اس سے زیادہ کسی اور کے خالص اور بے آمیز ہونے کی ضمانت نہیں تھی۔ اس شعور سے رہنمائی حاصل کرنے کا براہِ راست سلسلہ اگرچہ ختم ہو گیا لیکن اس سے حاصل شدہ وہ علم و ادراک موجود ہے جو قرآن کی معنوی دلالت سے اخذ و استنباط کیا ہوا ہے اور جس کا اصطلاحی نام "حدیث" ہے۔ یہ نام بھی قرآن سے لیا گیا ہے۔

قرآنِ حکیم میں یہ "دستور" اور کتابوں کی طرح یکجا نہیں بیان کیا گیا بلکہ ایمانیات، اخلاقیات اور تاریخی واقعات وغیرہ کے ساتھ اس کو شامل کیا گیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآنی دستور کوئی منفرد شے نہیں بلکہ فکری و اخلاقی نظام کا ایک جزء ہے اور فلسفۂ تاریخ کی طاقت اس کی پشت پر ہے۔ جس نے تمام اجزاء کو حیاتیاتی تعلّق کے ساتھ اس طرح مربوط کر دیا ہے کہ کوئی جزء دوسرے سے جدائی کے بعد اپنی مطلوبہ افادیت نہیں برقرار رکھ سکتا۔ غور سے دیکھا جائے تو یہ اندازِ بیان دستور کو مؤثر بنانے، ثبات و استحکام بخشنے، وحدت و یکسانیت برقرار رکھنے اور ماضی و حال میں گہرا ربط پیدا کرنے کے لئے ناگزیر ہے۔

زندگی ارتقاء پذیر ہے تو اس کو منظم کرنے والے قوانین لازمی طور سے ارتقاء پذیر ہوں گے۔ لیکن دونوں کو آوارہ گردی سے بچانے کے لئے ارتقاء کی سمت اور شاہراہ کا تعین لازمی ہے کہ ان کے بغیر زندگی اور قانون کی حرکت صحیح سمت کی جانب متعین شاہراہ پر نہیں ہوسکتی۔ یہ اندازِ بیان نہ صرف حرکت درست رکھنے کا انتظام کرتا ہے بلکہ زندگی اور قانون کے درمیان ایسے ربط و تعلق کی نشاندہی کرتا ہے کہ دونوں کی حرکت ایک دوسرے کیلئے لازم بن جاتی ہے۔ اگر کسی زمانہ میں یہ تلازم نہ برقرار رہا اور زندگی اپنے ارتقائی مراحل میں قانون کو ساتھ رکھنے میں کامیاب نہ ہوسکی تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ زندگی کی وہ شعوری سطح ابھی نمودار ہی نہیں جو اس کو قانونی ارتقاء پر مجبور کرے صرف چمک دمک دیکھ کر دھوکہ ہو رہا اور سراب پہ پانی کا حکم لگایا جا رہا ہے۔

زندگی اور قانون کی حرکت اور دونوں کے درمیان تلازم کو سمجھنے کے لئے ختم نبوّت کے بعد وہ منظر دیکھنا مفید رہے گا کہ جب زندگی کو ایرانی تہذیب اور رومی تمدن سے سابقہ پڑا اور نئی نئی ضرورتیں اُبھر کر سامنے آئیں جن کی بنا پر قانون کی سادگی کو تمدّن کی چاشنی کا رنگ دینا پڑا اور اس حد تک وسیع کرنا ناگزیر ہوگیا کہ "دستور" کی دوامی اور عالمگیر پوزیشن برقرار رہے۔ شعورِ نبوّت کے رمز شناسوں اور شعورِ اجتہاد کے قاموس نگاروں کو اللہ کروٹ کروٹ چین نصیب کرے کہ انہوں نے جس انداز سے اس چیلنج کو قبول کیا اور جس نیّت کے ساتھ قانون کے دامن کو وسیع کیا وہ قانونی تاریخ کا روشن باب ہے جو رہنمائی کے لئے کھلا ہوا ہے۔ اگر خدانخواستہ ان پر جمود طاری ہوتا یا زندگی و قانون دونوں کے ایک ساتھ ارتقاء پر اُن کا ایمان نہ ہوتا تو قرآنی دستور صرف عرب میں محدود ہو کر رہ جاتا اور نمو پذیر زندگی اور ترقی پذیر معاشرہ کی دائمی رہنمائی کی صلاحیت ختم ہو جاتی۔ پھر آج وہ اس قابل ہی نہ رہتا کہ جرأت اور ہمّت اور دعویٰ کے ساتھ اس پر گفتگو کی جا سکے۔

قرآن حکیم میں "دستور" کی بنیاد فطرت پر قائم ہے جس کی حیثیت انکشافِ حقیقت کی ہے اور اس کے خیر و شرّ، جواہر و جراثیم اور طیّبات و خبائث کا فیصلہ قرآن حکیم میں موجود ہے۔ سماج پر اُس کی بنیاد قائم نہیں ہے کہ جس کے خیر و شرّ اور خوب و ناخوب کا فیصلہ سماج کرتا، اور اسی وقت تک باقی رہتا ہے جب تک سماج اس کی اجازت دیتا ہے

اس بناء پر زندگی اور قانون کے ارتقاء میں فطرت اور اس سے متعلق قرآنی فیصلوں کو نظرانداز نہ ہونے دینا چاہیئے۔ ورنہ زندگی خود زندگی سے گریزاں اور قانون آوارگی کا شکار ہو جائے گا۔

پھر یہ فطرت انسان کی فطرت ہے جس کو اللہ نے پیدا کیا اور اپنی خلافت اور کائنات کی قیادت کے عظیم منصب سے سرفراز فرمایا۔ خلیفہ ہونے کی حیثیت سے اُس کی کشش اللہ کی طرف ہے، اور قائد ہونے کی حیثیت سے کائنات کی کشش اس کی طرف ہے۔ زندگی کے حالات و مساعدت میں اگر یہ کشش اور توازن برقرار نہ رہا تو پھر قانون اور زندگی کے درمیان رابطہ کا تعلق نہ پیدا ہو سکے گا۔ صرف ضابطہ کا تعلق رہ جائے گا جس کی بناء پر ظاہر و باطن میں یکساں قانون کی افادیت برقرار نہ رہ سکے گی

قرآنِ حکیم میں "دستور" کی ابتداء اس وقت سے بیان ہوئی ہے جب کہ انسان دُنیا میں خلافت و قیادت کے منصب پر سرفراز ہو کر آیا اور انتہاء اس وقت ذکر کی گئی ہے۔ جب کہ جوہرِ انسانیت کے قویٰ و خواص بلوغ کی حد میں داخل ہو گئے۔ اس اثناء میں دستور کے اجزاء کو مختلف مراحل سے گذارنے اور تجربہ کی کسوٹی پر کسنے کے لئے صدیوں کا نہیں بلکہ قرنوں کا موقع ملا ہے۔ ادھر جوہرِ انسانیت اس کی مدد سے رفتہ رفتہ اپنی خامی و کمی دور کرتا اور اپنی قوت و توانائی میں اضافہ کرتا رہا، یہاں تک کہ اس قابل ہو گیا کہ وہ علم و حکمت کا متحمل ہو سکے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض منصبی میں تعلیم حکمت داخل کرنا خود اس بات کی قرآنی ضمانت ہے کہ اب جوہرِ انسانیت پختگی کے اس مرحلہ پر پہنچ گیا ہے کہ انسان کا شعور دستوری اجزاء کی غرض و غایت اور ان کے اسرار و رموز سے واقفیت حاصل کر کے قانون و ارتقاء کو جاری رکھ سکے۔ اجتہاد کی بنیاد اسی حکمت پر قائم ہے جو ختم نبوت کے بعد بھی پذیرِ زندگی اور ترقی پذیر معاشرہ کی رہنمائی کا واحد ذریعہ اور "دستور" کی تکمیل کا اہم باب ہے ـــــ!!

قرآنِ حکیم میں "دستور" پر شاہد افضل الرسل، خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو بنایا گیا ہے۔ جن کے اثرات زندگی و معاشرہ پر ایسے ہی چھائے ہوئے ہیں جیسے ہر طرف آسمان چھایا ہوا نظر آتا ہے، اور جن کو موافق و مخالف سبھی نے تاریخ انسانی

کے منتخب لوگوں میں نمبر اوّل پر رکھا ہے۔ اس ذاتِ گرامی کو مقام شہادت پر کھڑا کر دینا اپنے اندر بڑی معنویت رکھتا ہے۔ آپ فہم و ادراک اور قول و عمل ہر لحاظ سے دنیا اور آخرت میں اس دستور کے شاہد ہیں۔

پھر آپ کے بعد آپ کی وراثت کے اصل مستحق وہ لوگ ہیں جنھوں نے آپ کی شہادت کو اپنی زندگی میں رچایا اور بسایا۔ ظاہر ہے کہ فرائض وراثت کی ذمّہ داری سے سبکدوشی صرف دستور کی ترجمانی سے نہیں ہو سکتی بلکہ اس کے لئے ہر دَور و زمانہ میں وہ تعبیر و تشریح اور اخذ و استنباط کی صلاحیت درکار ہے کہ جس کے ذریعے نمو پذیر زندگی اور ترقی پذیر معاشرہ کا رشتہ اس سے منقطع نہ ہونے پائے۔

یہ زندگی اور معاشرہ جوہرِ انسانیت کی انہیں صلاحیتوں سے وجود میں آئے گا جن کی پختگی کے بعد "دستور" آیا ہے اس بناء پر زندگی اور معاشرہ کی ترقّی سے جس قدر نئی جزئیات پیدا ہوں گی، ان کا اُصول و کلیّات میں موجود ہونا لازمی ہے، صرف ان سے اخذ و استنباط کی ضرورت ہے۔

قرآن حکیم میں "دستور" کو کامل و مکمّل شکل میں پیش کیا گیا ہے کہ اب اس میں تبدیلی یا کمی بیشی کی گنجائش نہیں ہے۔ اس حقیقت کو ذہن نشیں کرنے کے لئے تاریخِ انسانی کو دو حصّوں میں تقسیم کرنا مناسب ہے :

(۱) قبل ختمِ نبوّت اور (۲)۔ بعدِ ختمِ نبوّت

قبل ختمِ نبوّت میں جوہرِ انسانیت کے قویٰ و خواص کی خامی و کمی بتدریج دُور کی جاتی رہی۔ اس لئے ہر قوم اور ہر گروہ میں رسولؑ و نبیؑ آتے رہے اور دستوری اجزاء کا تجزیہ کرتے رہے۔ اگر اس مرحلہ میں دستور کی تکمیل کر دی جاتی تو نہ صرف یہ کہ جوہرِ انسانیت کے قویٰ و خواص کو پختگی نہ میسّر آتی بلکہ موجودہ خامی و کمی کو استقرار اور جماؤ حاصل ہو جاتا۔ پھر خلافت اور قیادت کا وہ تصوّر نہ ابھرتا جو ختمِ نبوّت کے بعد ابھرا ہے۔

بعد ختمِ نبوّت میں پہلے والی خامی و کمی دُور کرنے کا مرحلہ ختم ہو چکا تھا۔ اب بلوغ و پختگی کے بعد قویٰ و خواص سے ابھرنے والی صلاحیتوں کی ضابطہ بندی کا مرحلہ تھا جس کے لئے مختلف رسولوں اور نبیوں کا آتے رہنا یا دستور میں ردّ و بدل اور کمی بیشی کرتے رہنا دونوں سخت مضر تھے اس بناء پر صلاحیتوں کی ضابطہ بندی کے لحاظ سے

افضل الرّسلؐ اور اس کے لائے ہوئے دستور کو بقاء و دوام کی سعادت سے نوازا گیا۔

جوہرِ انسانیت نورانی اور حیوانی بنیادوں کے امتزاج کے بعد وجود میں آتا ہے اور اسی میں خلافت و قیادت کی صلاحیت پوشیدہ ہے۔ یہ صلاحیت نہ تنہا نورانی بنیاد میں ہے اور نہ تنہا حیوانی بنیاد میں ہے بلکہ ان دونوں کے امتزاج میں ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جوہرِ انسانیت میں نورانی و حیوانی بنیادوں کے درمیان "تجاذبی قوت" کی ایک حد مقرر ہے جو دونوں کی طبعی خصوصیات پر مبنی ہے۔ پختگی کے بعد اس مدّ میں اضافہ نہیں کیا جا سکتا ورنہ خلافت و قیادت کی صلاحیتوں کا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ جس طرح لوہے کے ٹکڑے میں خارجی مقناطیسی میدان کے ذریعہ لوہائی مقناطیسیت پیدا کرنے میں ایک حد ایسی آتی ہے کہ پیدا شدہ مقناطیسیت میں مزید اضافہ نہیں کیا جا سکتا، خواہ خارجی مقناطیسی میدان میں کتنا ہی اضافہ کیوں نہ کر دیا جائے۔

ختمِ نبوّت کے بعد جو "دستور" دیا گیا وہ اس حد کے لحاظ سے نہایت جامع و کامل ہے کہ حد کو اپنی جگہ رکھتے ہوئے اس پر مزید اضافہ کی گنجائش نہیں اور "حد" کو بدل دینے میں خلافت و قیادت کا نظام درہم برہم ہوتا ہے اس لئے "دستور" کو آخری شکل دے کر نبوّت و رسالت کا سلسلہ بھی ختم کر دیا گیا۔ اگر اس سلسلہ کو جاری رکھا جاتا تو ترقّی کی وہ نوع نہ وجود میں آتی جو ختم ہونے کے بعد وجود میں آئی جیسا کہ ختمِ نبوّت سے قبل کے حالات و واقعات سے ثابت ہے۔

رسولوں اور نبیوں کا جوہرِ انسانیت نورانی و حیوانی بنیادوں سے ترکیب پانے کے باوجود اس کا "آرگنائزیشن" ابتداء ہی سے اس نوع کے دوسرے انسانوں سے مختلف ہوتا ہے پھر خارج سے نورانی شعاعوں کے ذریعے اس کو اتنی نورانی قوت پہنچا دی جاتی ہے کہ جوہرِ انسانیت کی نورانی و حیوانی بنیادوں کے تناسب میں تبدیلی ہو جاتی، اور اس کے لحاظ سے علمی و عملی اکٹویٹی (ACTIVITY) میں تبدیلی ہوتی ہے۔

اس کی مثال ایسی سمجھئے کہ جس طرح برقی و مقناطیسی لہروں کے ڈالنے سے دماغی سیلوں کی برقی ACTIVITY میں تبدیلی کی جا سکتی ہے جو "سیل" کے مثبت و

منفی چارج کے تناسب میں تبدیلی رُونما ہوتی ہے۔ اسی طرح نورانی شعاعوں کے ڈالنے سے رسولؐ اور نبیؑ کے علمی و عملی ACTIVITY میں تبدیلی کی جاتی تھی جو جوہرِ انسانیت کے مثبت و منفی (نورانی و حیوانی بنیاد) چارج کے تناسب میں تبدیلی سے رونما ہوتی تھی لیکن اس تبدیلی اور نورانی شعاعوں کے ڈالنے کی بھی ایک حد مقرر ہے کہ اس کے بعد حیوانی بنیاد کے شعلے بجھ کر بشریت ختم ہو جاتی اور رسولؐ کی ذات دوسرے انسانوں کے لئے نمونہ نہیں رہتی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ "حد" انتہا کو پہنچ گئی تھی کہ اس کے بعد تکمیلِ انسانیت کا کوئی اور درجہ نہ رہ گیا تھا۔ اس بناء پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ذاتِ گرامی ختمِ نبوّت کی مستحق تھی۔ تکمیلِ انسانیت کے بعد ہی تکمیلِ "دستور" کا یہ مژدۂ جانفزا سنایا گیا ہے:

" اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا "

مذکورہ مثال سے یہ شبہ نہ کیا جائے کہ "سائنس" جوہرِ انسانیت میں تبدیلی سے رسول اور نبی بنا سکتی ہے؟ کیونکہ جسمِ انسانی میں جس حد تک اُس کی رسائی ہوئی ہے، اسی میں کارگذاریاں اس کی حد درجہ محدود ہیں۔ مثلاً دماغی سیلوں کا "آرگنائزیشن" ہر انسان میں یکساں نہیں ہوتا بلکہ پیدائشی طور پر مختلف ہوتا ہے (جس میں انسان کو کوئی دخل نہیں) اس لئے برقی و مقناطیسی لہروں کے ڈالنے سے یکساں تبدیلیاں بھی نہیں کی جا سکتی ہیں۔ سائنس کی رسائی جوہرِ انسانیت تک ابھی نہیں ہو سکی۔ نورانی شعاعیں (جو اس پر ڈالی گئی تھیں) بھی اس کی دسترس سے باہر ہیں۔ پھر رسولؐ اور نبیؑ کے جوہرِ انسانیت کا آرگنائزیشن دوسرے تمام انسانوں سے پیدائشی طور پر مختلف تھا اس لئے نورانی شعاعوں کے ڈالنے سے کسی اور انسان میں نہ ویسی تبدیلی کا سوال پیدا اور نہ تبدیلی کے نتیجے میں ویسی علمی و عملی ACTIVITY کے ظہور کی گنجائش نکلتی ہے۔ یہ مثال نبوّت و رسالت کو محض قریب الفہم بنانے کے لئے دی گئی ہے، کوئی اور تشبیہ مقصود نہیں ہے ـــــ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝

قرآن حکیم اور محروم طبقات

مولانا محمد حسین میر

تمہیدی کلمات : صاحبِ صدر اور معزز سامعین!

مَیں نے اپنی گفتگو کے لئے جو موضوع منتخب کیا ہے وہ ہے "قرآن حکیم اور محروم طبقات" ممکن ہے یہ سنتے ہی معاً آپ کو یہ خیال آئے کہ مَیں قرآن حکیم کے حوالے سے آپ کے سامنے اسلام کا اقتصادی نظام پیش کرنے چلا ہوں ہرگز نہیں بلکہ قرآن حکیم کے مطالعہ کے دوران، ان طبقات کے بارے میں اس کا جو رویّہ میرے سامنے آیا اور جس نے میرے ذہن پر ایک گہرا نقش چھوڑا، مَیں نے چاہا کہ اپنا وہ تأثر آپ کے سامنے رکھ دوں۔ قرآن مجید کے مطابق ان محروم طبقات کی محرومیوں کا دائرہ بہت وسیع ہے، وہ سیاسی بھی ہیں اور تہذیبی بھی، اقتصادی بھی اور سماجی بھی۔

قرآن حکیم کے اس رویّہ کی تصویر کشی سے میرا مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ اسے ان سے کس قدر ہمدردی ہے اور وہ کس طرح ان کو اوپر اٹھانا چاہتا ہے سماجی یا اقتصادی لحاظ سے پسے ہوئے عوام اب اپنی موجودہ حالت پر قانع رہنے کے لئے تیار نہیں۔ ان کے تیور بدل چکے ہیں، اور وہ ہر ایسے سماج یا اقتصادی نظام سے جس سے ان کی اس زبوں حالی کو استحکام اور دوام ملتا ہو، نہ صرف ٹکرا جانے پر آمادہ ہیں بلکہ اپنی سابقہ محرومیوں کا بدلہ بھی چکانا چاہتے ہیں۔ ساری دنیا میں اقتصاد و معیشت کی اس دَور میں غیر معمولی اہمیت سے اٹھنے والے طوفانوں میں ہمارا فرض ہے کہ ہم قرآن حکیم کی روشنی میں اپنی راہ متعیّن کریں اور دیکھیں کہ

اس کا جھکاؤ کس طرف ہے تاکہ اسلام کی کشتی ان طوفانوں کے تھپیڑوں سے محفوظ رہ کر دکھی انسانیت کو امن و سکون اور خوش حالی و رفاہیت کے ساحلِ مراد تک پہنچا سکے ــــــ !!

میرے تتبع کے مطابق قرآنِ حکیم میں چار محروم طبقات کا ذکر ملتا ہے مشاغل زندگی کے وسیع تر ہو جانے کی وجہ سے ہو سکتا ہے کہ اب محروم طبقات کا شمار بڑھ گیا ہو۔ لیکن اگر بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو نام کی تبدیلیوں سے قطع نظر سب کے ان چار کے ذیل میں لایا جا سکتا ہے اور ان کے متعلق قرآنِ حکیم کی دی ہوئی روشنی سے ہم دُور دُور تک اُجالا کر سکتے ہیں۔ قرآنِ حکیم کا وہ فرمان جو حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی بعثت کا مقصد و مدّعا واضح کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا تھا ہماری ہمہ جہت رہنمائی کے لئے بس کرتا ہے۔ ہر ذوقِ سلیم رکھنے والا شخص سمجھ سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد صرف بنی اسرائیل ہی کے لئے نہ تھا بلکہ ہر دور کے پسے ہوئے طبقات کے بارے میں اس کو یہی مطلوب و مقصود ہے۔ فرمانِ خداوندی یہ ہے :-

" وَ نُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ وَ نَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّ نَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ وَ نُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ " یعنی ہم چاہتے ہیں کہ جن لوگوں کو ہماری زمین پر کمزور بنا دیا گیا تھا۔ ان پر احسان کریں۔ انہیں امام و پیشوا بنائیں۔ انہیں ملک کے وارث بنائیں اور انہیں زمین میں اقتدار بخشیں۔ آیۂ کریمہ میں لفظ اُسْتُضْعِفُوْا بصیغۂ مجہول قابلِ غور ہے۔ مطلب یہ کہ ایسے سماجی سیاسی اور اقتصادی نظام رائج کیے گئے کہ کچھ لوگ کمزور، پس ماندہ اور زیر دست بن کر رہ گئے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اپنے پیغمبر کے ذریعے اس کی جگہ ایک ایسا نظام قائم کریں کہ کمزور طاقتور ہوں، انہیں ملک کے وسائلِ معیشت اور اقتدار میں حصّہ ملے۔

آئیے ! اب ہم قرآن مجید کے اندر مذکور محروم طبقات کو ایک ایک کر کے لیتے ہیں اور معلوم کرتے ہیں کہ اس نے ان کے بارے میں کیا روش اختیار کی ہے۔

قرآنِ حکیم اور محروم طبقات

عورت روزِ اوّل ہی سے مرد اپنی قوتوں اور صلاحیتوں لے کر پیدا ہوا ہے کہ وہ کشمکشِ حیات میں جرأت مندانہ حصّہ لے سکتا اور حوادث و مشکلاتِ زمانہ کا مقابلہ

زیادہ حوصلے کے ساتھ کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کارزارِ حیات میں ہمیشہ اسی کا کردار نمایاں رہا ہے جب کہ عورت کمزور اور منفعلانہ فطرت پر پیدا کی گئی ہے۔ اس لئے جدّوجُہد زندگی میں وہ زیادہ تر پسِ پردہ ہی رہی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مرد کے اندر احساسِ برتری نے سر اٹھایا اور وہ اپنے مقابلہ میں عورت کو حقیر اور کمتر تصوّر کرنے لگا۔ یہ احساس آہستہ آہستہ ترقّی کرتا چلا گیا اور نوبت بایں جا رسید کہ معاشرے میں عورت بالکل ہی بے وقار ہو کر رہ گئی، وہ خود بھی احساسِ کہتری میں مبتلا ہو گئی۔ اس کی یہ تحقیر اس قدر جڑ پکڑ گئی کہ رسم و روایت سے آگے بڑھ کر اس نے فلسفہ میں نظریے اور مذہب میں عقیدے کی شکل اختیار کر لی۔ چنانچہ کوئی تو اسے سرے سے موجود ہی ماننے کے لئے تیار نہ ہوا۔ کسی نے اس کو مرد کے جی بہلانے کا صرف ایک کھلونا قرار دیا۔ کچھ نے اسے ناگزیر برائی سمجھ کر بادلِ ناخواستہ قبول کیا اور کچھ نے اسے ابن آدم کی تمام بدبختیوں کا ماخذ و منبع قرار دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اسے مرد کی زندگی میں اس کی ذاتی بن کر رہنے اور اس کی موت پر اس کے ساتھ زندہ جل کر مر جانے کا حکم دیا گیا۔ ان حالات میں جبکہ اس کے نفسِ وجود ہی سے انکار کیا جا رہا تھا، کیسے ممکن تھا کہ اس کا ایک مستقل تشخّص مانا جاتا، یا اس کے کچھ حقوق تسلیم کئے جاتے۔ عورت کے ساتھ یہ سلوک، اس وقت کے نام نہاد روشن خیال، تہذیب و تمدّن اور علم و دانش کے مرکز ممالک، مثلاً چین، روم، ہندوستان اور یونان وغیرہ میں روا رکھا جا رہا تھا تو عربوں کی اُجڈ اور جاہل قوم سے اس بارے میں کسی بہتر سلوک کی کیا توقع کی جا سکتی تھی۔ ان کے معاشرے میں عورت کی جو دُرگت بن رہی تھی وہ تاریخ دان حضرات سے مخفی نہیں۔ اس کا درجہ معاشرتی لحاظ سے بے حد پست تھا۔ اس کی پیدائش خاندان کے لئے باعثِ ننگ تصوّر کی جاتی تھی۔

قرآن مجید کہتا ہے: واذا بشّر احدھم بما ضرب للرّحمٰن مثلاً ظلّ وجھہ مسودًّا وھو کظیم ۝ سفّاکی کی حد یہ ہے کہ اس عار سے بچنے کے لئے انہیں اپنے ہاتھوں زندہ گڑھوں میں دفن کر دیا جاتا تھا۔ قرآن مجید شہادت دیتا ہے:۔ وَاِذَا الْمَوْءُدَۃُ سُئِلَتْ بِاَیِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ۔

عورتوں کے ساتھ وابستگی کے، نکاح کے معروف طریقے کے علاوہ اور بھی کئی واہیات قسم کے طریقے رائج تھے۔ نکاح میں مردوں پر تعداد کی کوئی پابندی نہ تھی۔

ایک مرد جس تعداد میں چاہتا تھا، عورتیں اٹھا کر گھر میں ڈال لیتا تھا۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ باپ کی منکوحات کا پورے کا پورا گلہ، سوائے حقیقی ماں کے بیٹوں کی طرف اسی طرح منتقل ہو جاتا تھا جس طرح اس کی دوسری جائداد، ڈھور ڈنگر وغیرہ۔ وہ جب چاہتا کسی عورت کو کچے دھاگے سے باندھ کر اپنے حرم میں لا ڈالتا اور جب چاہتا اُس دھاگے کو توڑ کر اسے پرے پھینک دیتا۔ عورت سے نہ جوڑتے وقت کوئی رائے لی جاتی نہ توڑتے وقت۔ رشتۂ ازدواج میں نتھی کر لینے کے بعد بھی اسے طرح طرح کے کچوکے دیئے جاتے۔ نکاح اور طلاق، پھر نکاح اور پھر طلاق کی صورت میں اُسے بار بار جھٹکے دیئے جاتے۔ اُس کیلئے مقرر کئے ہوئے مہر کو واپس لینے کے لئے طرح طرح کے حربے استعمال کئے جاتے اور بعض دفعہ تو عورت کو کچھ پلّے سے دے کر گلوخلاصی کرانی پڑتی۔ ایسے میں اس بات کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ عورت کا سماج پر بھی کوئی حق ہو اور معاملاتِ زندگی میں اس کی بھی کوئی آزادانہ رائے ہو۔

ظلم و ستم سے تپتے ہوئے اس انسانی صحرا میں، عورت حُسنِ سلوک اور شریفانہ برتاؤ کی پیاس سے تڑپ رہی تھی کہ قرآن حکیم اس کے لئے ابرِ رحمت بن کر برسا اور اس طرح برسا کہ اس کے برسائے ہوئے آبِ حیات سے نہ صرف اُس کی پیاس بجھ گئی بلکہ اس میں جان تازہ آگئی۔ قرآنِ حکیم نے مردوں کو مخاطب کرتے ہوئے اعلان کیا کہ سُنو! " هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ " انسانی زندگی کی گاڑی کو رواں دواں رکھنے کے لئے عورت کا وجود تمہارے لئے اتنا ہی ضروری ہے جتنا تمہارا ان کے لئے اور پھر اُن کے حقوق کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا: " وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ!" کہ بے شک عورت پر کچھ فرائض بھی ہیں لیکن اُس کے حقوق بھی اتنے ہی ہیں جو تم پر فرض ہیں۔ یہ معاملہ یک طرفہ نہیں۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے مردوں کو عورتوں کا قوام بنایا ہے اور اس طرح انہیں ایک حد تک فوقیت حاصل ہے۔ مگر قوّام وہ ہوتا ہے جو کسی کے حقوق کا محافظ و نگران ہو جو انہیں قائم و بحال رکھے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو وہ غاصب و ظالم ہے، قوّام نہیں۔ پھر مردوں کو حکم دیا گیا کہ: " عَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ!" کہ عورتوں کے ساتھ بھلے لوگوں کی طرح زندگی گذارو! اسی لئے حضورِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ: " خیرکم، خیرکم لِاَھلِہٖ وانا خیرکم لِاَھلی!" ——— !!!

قرآنِ حکیم میں عائلی زندگی سے متعلق جتنی بھی ہدایات دی گئی ہیں، سب مردوں کو دی گئی ہیں، کیونکہ زیادتی انہی کی طرف سے ہو رہی تھی۔ ان آیات کو غور سے پڑھا جائے تو صاف پتہ چلتا ہے کہ قرآنِ حکیم کس طرح عورتوں کے چھنے ہوئے حقوق انہیں واپس دلا رہا ہے۔ اس سلسلہ میں اوّلین معاملہ نکاح کا ہے چنانچہ اس بارے میں بھی ان سے رائے لینے کا حکم دیا گیا۔ ایک مرد سے طلاق ہو جانے کے بعد عورت کی مرضی پہ چھوڑ دیا گیا — نہ کہ مردوں کی مرضی پر — کہ وہ جہاں چاہے پہلے خاوند سے دوبارہ یا کہیں اور جائز طریقے سے شادی کرے۔ مردوں کو روکنے کا کوئی حق نہیں۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے:

(۱) "اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ"

(۲) ...."فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِیْۤ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ۔!"

اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں: لا تنکح الایّم حتّٰی تستامر ولا تنکح البکر حتّٰی تستاذن — مہر کو ان کا حق قرار دیا اور اسے حیلے بہانوں سے واپس لینے کو مروّت کے خلاف اور ایک قسم کی خست و دناءت قرار دیا۔ چنانچہ فرمایا:

"لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْئًا!"

مردوں کو یہ تاکید بھی کی گئی کہ اگر انہیں اپنے ساتھ رکھنا ہے تو شریفانہ طریقے سے رکھو اور اگر علیحدہ کرنا بھی ہے تو نیکی و احسان کے ساتھ انہیں رخصت کرو، انہیں درمیان میں ادھر لٹکتا ہوا نہ چھوڑو۔ امسکوھن بمعروف — اَوْ سرحوھنّ باحسان۔ نکاح کی معروف صورت کے علاوہ، بدمعاشی پر مبنی باقی تمام صورتوں کو ممنوع قرار دے دیا اور کہا کہ: اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ۔

مردوں نے عورتوں کے جسموں کو آمدنی کا ذریعہ بنا رکھا ہے اور انہیں عصمت فروشی پر مجبور کیا جاتا تھا۔ قرآن مجید نے سختی کے ساتھ اس سے منع کیا اور کہا کہ: لا تکرھوا فتیاتکم علی البغاء اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے: مَهْرُ الْبَغِيِّ حَرَامٌ فرما کر اس کا دروازہ بالکل بند کر دیا۔ قرآن حکیم نے طلاق کے بعد مرد کو یہ حق بھی نہیں

دیا کہ وہ اپنے نومولود بچّے کو دودھ پلانے کے لئے اسے مجبور کر سکے بلکہ اسے عورت کی رضامندی پر چھوڑا اور ساتھ ہی اتنے عرصے کے لئے، عورت کے تمام اخراجات مرد پر ڈالے۔ چنانچہ حکم ہوتا ہے کہ: "عَلَی الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ۔ حلدیہ ہے کہ مرنے والوں کی جائداد میں عورت کے، بیوی، بیٹی، بہن اور ماں ہونے کی حیثیت میں باقاعدہ حصّے مقرر کئے گئیں۔ آیۂ توریث کو پڑھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ نازل ہی صرف عورتوں کے حقوق بیان کرنے کے لئے ہوئی ہے۔ مردوں کا ذکر تو صرف ضمناً آگیا ہے، قرآن حکیم نے عورتوں کو یہ وہ حق دیا ہے جو اس وقت تو کوئی اور قوم کیا دیتی، ہمارے دور کی بہت سی ترقی یافتہ اور مرد و زن کی مساوات کی علمبردار قوموں نے بھی نہیں دیا۔

قرآن حکیم نے طبقۂ نسواں کے متعلق اپنی روش کچھ اس طرح رکھی ہے کہ جہاں وہ مردوں کی سیہ کاریوں کا ذکر نہایت تفصیل سے کرتا ہے، عورتوں کا ذکر اس طرح نہیں کرتا۔ صرف ایک دو واقعات کا استثنا رہے، اگر کہیں کیا ہے تو مردوں کے ضمن میں۔ اللہ تعالیٰ کو ان کی خاطرداری و دلجوئی کا اتنا پاس ہے کہ مفسّرین کی روایت کے مطابق، بعض آیات ان کی فرمائش و خواہش پر بصیغۂ تانیث نازل ہوئیں۔

قرآن مجید میں اگر کچھ سورتیں مردوں کے نام پر ہیں تو عورتوں کو بھی اس افتخار سے محروم نہیں رکھا گیا بلکہ بعض سورتیں جیسے النّساء اور مریم ان کے نام سے مُعَنْوَن کر دیں۔ حضرت خولہ بنت ثعلبہ بن مالک سے ان کے خاوند نے ظہار کیا تو قرآن مجید پڑھ کر اندازہ لگائیے کہ اس کا لہجہ ان کے بارے میں کتنا دھیما، محبّت آمیز، ہمدردانہ اور رحم و کرم سے لبریز ہے۔ جب کہ ان کے خاوند کے بارے میں کتنا تند و تلخ اور پُر عتاب ہے۔ نبی علیہ السّلام نے عربوں کے ذہنوں سے عورتوں کے متعلق اس تحقیر کو جو متوارث چلی آتی تھی۔ نکالنے کے لئے ہی فرمایا تھا کہ مجھے تمھاری دُنیا سے تین چیزیں محبوب ہیں نماز خوشبو اور طبقۂ نسواں۔ آپ کو اس کمزور طبقے کے حقوق کا اس قدر اہتمام تھا کہ حجّۃ الوداع اور رحلت کے وقت بھی وصیّت فرمائی کہ ان کے حقوق کا خیال رکھنا اور ان کے ساتھ اچھّا سلوک کرنا۔

قرآن مجید نے انسانی معاشرے کے اس صدیوں سے پستے چلے آتے طبقے کو جو حقوق دیئے، انہی کا نتیجہ تھا کہ عورتوں میں خود اعتمادی پیدا ہوئی اور وہ جو حیوانِ غیر ناطق

بن کر رہ گئی تھیں۔ اب عمرؓ جیسے مردوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باتیں کرنے لگیں، اور جب انہیں اس پر تعجب ہوا تو انہوں نے ازواج مطہرات اور حضورؐ کا حوالہ دیا اور پھر وقت بھی آیا کہ ایک خاتون نے حضرت عمرؓ جیسے باہیبت خلیفہ کو برسرِ منبر ٹوک دیا کہ جب ہمارے خدا نے ہمارے مہر کی کوئی حد مقرر نہیں کی تو تم کو اس کا کیا حق ہے؟ اور انہیں اس عورت کے سامنے گردن ڈال دینا پڑی اور اپنا حکم واپس لے لیا۔ وہ امورِ سلطنت میں عورتوں سے مشورے لیا کرتے تھے اور حضرت شفا بنت عبداللہ کو اشیائے صرف کی قیمتوں پر کنٹرول کا کام سپرد کر رکھا تھا۔ عورتیں مختلف کام کر کے اپنی روزی کماتی تھیں۔ قرآنِ حکیم نے عورتوں کو گواہی کا حق دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ گواہی واقعاتِ زندگی میں شرکت یا ان کے مشاہدے کے بعد ہی دی جا سکتی ہے۔

مَیں سمجھتا ہوں کہ اسلام میں پردے کا حکم بھی عورت کے تحفظ اور اس کی حرمت کو قائم رکھنے کے لئے دیا گیا ہے — اسلام کو ان کا تقدس اس قدر عزیز ہے کہ وہ نہیں چاہتا کہ کسی کی گناہ آلود نگاہیں اس پر پڑیں۔ اس طرح یہ حکم کسی ناروا پابندی کی بجائے اس کے حق احترام و اکرام کی ذیل میں آتا ہے۔

ممکن ہے کچھ لوگ کہیں کہ یہ تم نے کیا بے وقت کی راگنی چھیڑ دی۔ اب تو عورتوں کا راج ہے اور مرد ان کا پانی بھرتے ہیں۔ یہ صورتِ حال کا صرف سطحی مطالعہ ہے۔ بہ نظرِ غائر جائزہ لیا جائے تو عورت اب بھی مظلوم ہے۔ بے شک اسے بہترین لباس اور بہترین خوراک مہیا کی جائے گی، اس کے رنگ روغن کے لئے مسالہ بھی مہیا کر دیا جائے گا اور اسے کار میں بٹھا کر یا انگلی سے لگا کر سڑکوں اور پارکوں میں چہل قدمی بھی کرائی جائے گی لیکن اگر آپ غور سے مطالعہ کریں گے تو محسوس کریں گے کہ مرد اس طرح صرف اپنی آزاد خیالی ترقی پسندی اور سب سے زیادہ اپنی دولت مندی کا اظہار کر رہا ہے اور عورت کو صرف ماڈل گرل کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ مرد اپنے سارے کاروبار کو فروغ دینے کے لئے اسے استعمال کر رہا ہے۔ ہمارے اخبارات، ہمارے رسائل، ہماری تجارت، ہمارا ادب غرض کوئی ایسا شعبۂ حیات نہیں، جس میں عورت کو استعمال نہ کیا جا رہا ہو۔ یہ مقابلہ ہائے حسن، یہ سماجی تقریبات، یہ ریڈیو اور فلم پر نسوانی آواز اور تصویر سب مرد کی ہوس کاریوں کے مظاہر ہیں۔ عورت کو اپنے جذبات کی تسکین کے لئے برسرِ عام رسوا

کیا جا رہا ہے۔ مگر عورت اپنی سادہ لوحی کی وجہ سے، مرد کے اصل جذبات و محرکات سے بے خبر، اس بات پر خوش ہو رہی ہے کہ اسے مرد کے برابر حقوق مل گئے حالانکہ وہ اپنے حقوق سے آج بیسویں صدی میں بھی اسی طرح محروم ہے جس طرح چوتھی اور پانچویں صدی میں تھی۔ اسے تلخ حقیقت کا اس وقت سامنا کرنا پڑتا ہے جب وہ کسی معاملہ میں مرد کے سامنے اپنی رائے کا آزادانہ اظہار کرتی ہے یا مرد کی کسی خواہش نفس کے خلاف جاتی ہے چاہے وہ کتنی ہی سچائی پر کیوں نہ ہو۔ طلاق کی تلوار آج بھی اس کے سر پر بدستور لٹک رہی ہے۔ طلاق دینے کے غیر اسلامی طریقے آج بھی اس کی زندگی کو بدستور تلخ بنا رہے ہیں اس کا حق مہر باندھنے کو تو کئی کئی لاکھ روپے باندھ لیا جاتا ہے مگر ملتی اسے ایک کوڑی بھی نہیں۔ جب تک وہ اپنے ساتھ مرد کی کئی پشتوں تک چلنے والا ساز و سامان لے کر نہ آئے، کوئی اسے قبول کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔ نئے گھر میں داخل ہوتے ہی اسے چاروں طرف سے رقیبوں اور حریفوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جن میں گھر کر وہ اپنی زندگی کو گھن لگا لیتی ہے۔ جہاں تک حق وراثت کا تعلق ہے، اس اسلامی ملک کے مسلمان باشندوں نے قسم کھا رکھی ہے کہ یہ حق تو اسے کسی قیمت پر نہ لینے دیں گے۔ چنانچہ کہیں تو ان سے زبردستی اقرار نامے لکھوا لئے جاتے ہیں اور کہیں ایسا بھی ہوتا ہے کہ سگے بھائی محض چند مرلے زمین کی خاطر اپنی بہنوں کو اپنے ہاتھوں ٹھکانے لگا دیتے ہیں۔ اس طرح عورت آج بھی پاؤں کی جوتی ہے، جب چاہا اُتار پھینکی۔ الغرض جاہلیتِ اُولیٰ میں عورت کے ساتھ جو سلوک کیا جا رہا تھا، اگر آپ انصاف سے کام لیں گے تو محسوس کریں گے وہی سلوک اس کے ساتھ جاہلیتِ ثانیہ کے اس دور میں کیا جا رہا ہے۔ حقوق کشی اور ظلم و ستم کی اس فضا میں ہماری عائلی زندگی میں کبھی امن و سکون نہیں آ سکتا۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے معاشرے میں استحکام اور امن و سکون ہو تو ہمیں عورت کے وہ تمام حقوق اور عورت کا وہ مقام بحال کرنا ہوگا جو قرآن حکیم نے اُسے دیا ہے۔

یتیم یتیم کسی معاشرے کا مستقل مظلوم طبقہ تو نہیں ہیں بلکہ باپ کے سایۂ شفقت سے محروم ہو کر بے سہارا ہو جانے کی وجہ سے عموماً ان کے لئے لوگ اپنے دلوں میں جذبۂ ترحم محسوس کرتے ہیں تاہم اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ ایسے سنگدل لوگ ہمیشہ موجود رہے ہیں جو اُن کی مضبوط پشت و پناہ نہ ہونے کی وجہ سے ان کا استحصال کرتے

رہے ہیں اور ان پر ظلم وستم توڑنے سے نہیں چوکتے۔ ناممکن تھا کہ مظلوموں اور محروموں کا حامی (قرآن) ان کے بارے خاموش رہتا۔

۱۔ اس نے سب سے پہلے خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی اپنی یتیمی یاد دلائی اور بتایا کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کو یتیمی کی بے سروسامانی کی حالت سے نکال کر اپنے پاؤں پکڑا کیا، پھر معاً یہ نصیحت کی کہ جب تمھیں اپنے ذاتی تجربے سے معلوم ہے کہ ایک یتیم بچہ کس طرح اس بھری دُنیا میں اپنے آپ کو یکہ وتنہا اور بے سہارا محسوس کرتا ہے۔ اس کے دل میں کتنے ہی ارمان اٹھتے اور ڈوب جاتے ہیں مگر کوئی ان کو پورا کرنے والا نہیں ہوتا۔ ناز و نیاز کی کتنی ہی کیفیتیں اس کے ننھے دل پر گذرتی ہیں مگر اُن کے اظہار کے لئے اسے کوئی شفقت بھری ناز بردار گود میسّر نہیں آتی۔ وہ چلنا چاہتا ہے تو کوئی اس کی انگلی پکڑنے والا نہیں ہوتا۔ وہ ٹھوکر کھا کر گرتا ہے تو کوئی اسے اٹھانے والا نہیں ہوتا۔ اس لئے کسی یتیم پر سختی کر کے اس کے آبگینۂ دل کو ٹھیس نہ پہنچانا: اَمَّا الْیَتِیْمَ فَلَا تَقْهَرْ۔ خود مہبطِ وحی کو مخاطب کرتے سے مقصود یہ ہے کہ اُمّت اس کی اہمیّت کو سمجھ لے۔ اسی پر بس نہیں قرآنِ حکیم تو یہ چاہتا ہے کہ ان کی بے کسی کی وجہ سے ہمارے دلوں میں ان کے متعلق استحقار واستصغار پیدا نہ ہونے پائے۔ بلکہ اس کی جگہ ان کے لئے دلوں میں جذبۂ اکرام واحترام ہو اور جو لوگ انہیں حقیر سمجھتے ہیں انہیں عذابِ الیم میں ڈالتے ہوئے کہا جائے گا کہ تم یتیموں کا اکرام نہیں کرتے تھے: "بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ"!

۲۔ پھر ان بے سہارا اور بے وسیلہ یتیموں کی ضروریاتِ معاش مہیّا کرنے کو بہت بڑی نیکی قرار دیا۔ I۔ فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ۝ فَكُّ رَقَبَةٍ ۝ اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ ۝ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۝ ۔

II۔ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى ۔

۳۔ زکوٰۃ وصدقات کے مصارف میں یتیموں کو ایک اہم مصرف قرار دیا تاکہ سماج یا حکومت ان کی کفالت اپنے ذمّے لے سکے۔

چند خدا ترس، خوشحال لوگ آسانی سے یتیموں کی ضروریاتِ معاش تو شاید مہیّا کر دیں۔ لیکن جب تک اُن کو سماج میں اہمیّت نہ دی جائے وہ اپنے آپ کو اس سے کٹا ہوا

محسوس کرتے رہیں گے اور ایک شدید احساسِ تنہائی انہیں ہر لمحہ اندر سے کاٹتا رہے گا۔ اس امر کے سدِّباب کے لئے قرآنِ حکیم نے یہ انتظام کیا کہ مسلمانوں کو پہلی بیویوں کی موجودگی میں یتیم بچّوں کی ماؤں کے ساتھ شادی کرنے کی اجازت دے دی تاکہ ایک طرف وہ ایک خاندان سے وابستہ ہو کر احساسِ تنہائی و بے کسی سے نجات پا سکیں اور دوسری طرف ان کی مائیں اپنے نئے خاوندوں سے انہیں شفقتِ پدری دلا سکیں۔ چنانچہ فرمایا کہ:

"وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ۔

ہوتا یہ تھا کہ اگر کوئی یتیم بچّی کسی کھاتے پیتے باپ کی بیٹی ہے اور اس نے ورثہ میں کافی جائداد پائی ہے تو حریصِ ورثہ اسے اس بات کی اجازت نہ دیتے کہ وہ اپنی آزاد مرضی سے کسی دوسرے گھرانے میں شادی کرلے کہ کہیں اس کی جائداد ادھر منتقل نہ ہو جائے یا اسے زبردستی اس کی مرضی کے برخلاف اپنے خاندان کے کسی فرد سے نتھی کر دیتے تاکہ وہ جائداد انہیں کے پاس رہ جائے اور انہیں مہر وغیرہ دینے کی زحمت بھی نہ اٹھانا پڑے۔ ان تمام زیادتیوں سے یہ کہہ کر روک دیا گیا کہ:

اَللّٰہُ یُفْتِیْکُمْ فِیْھِنَّ وَمَا یُتْلٰی عَلَیْکُمْ فِی الْکِتٰبِ فِیْ یَتٰمَی النِّسَآءِ الّٰتِیْ لَا تُؤْتُوْنَھُنَّ مَا کُتِبَ لَھُنَّ وَتَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْکِحُوْھُنَّ وَالْمُسْتَضْعَفِیْنَ مِنَ الْوِلْدَانِ وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْیَتٰمٰی بِالْقِسْطِ۔

سنگدل قسم کے رشتہ داروں کے لئے سب سے مرغوب صورت یہ ہے کہ یتیم کی خیر خواہی کے نام پر اس کے مال کو اپنے مال میں ملا کر کاروبار میں لگایا جائے۔ اور اس آڑ میں آہستہ آہستہ اس کے مال کو ہضم کر لیا جائے۔ خسارے یا کثیر اخراجات کا بہانہ بنا کر اس کی جائداد کو ٹھکانے لگا دیا جائے۔ اس سلسلے میں ایک طرف تو یہ فرمایا کہ وہ تمہارے بھائی بند ہیں۔ اگر نیک نیتی سے انہیں اپنے ساتھ ملاؤ گے تو یہ اپنے ہی بھائیوں کی بھلائی اور خیر خواہی ہوگی۔ لیکن یہ یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ کی تمہاری نیتوں پر پوری طرح نگاہ ہے وہ خوب جانتا ہے کہ کون ان یتیموں کے حالات کو سدھارنا چاہتا ہے اور کون اُن کا مال اُڑانا چاہتا ہے۔ اس کی پکڑ سے ڈرو، اُن کے مال کو کھانا گویا اپنے پیٹ میں جہنم کے شعلے اُتارنا ہے: (۱) وَلَا تَاْکُلُوْٓا اَمْوَالَھُمْ اِلٰٓی اَمْوَالِکُمْ اِنَّہٗ کَانَ حُوْبًا کَبِیْرًا

لَا تَاْكُلُوْهَآ اِسْرَافًا وَّ بِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا۔

(۲) اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا وَّسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا۔

ساتھ ہی یہ حکم بھی دیا کہ جب تک تمھیں یہ یقین نہ ہو جائے کہ وہ اپنے نفع و نقصان کو سمجھنے لگے ہیں اور اُن میں اپنا کاروبارِ معاش خود چلانے کی صلاحیت پیدا ہو گئی ہے اس وقت تک اُن کا سرمایہ اُن کے حوالے نہ کرو۔ ایسا نہ ہو کہ وہ نادانی میں اپنا سرمایہ تباہ کر لیں اور پھر کوڑی کوڑی کے محتاج ہو جائیں۔ قرآن حکیم کو اُن کے سرمایہ کے تحفظ کا اس قدر اہتمام ہے اور اُن کے مستقبل کی اتنی فکر ہے کہ وہ سرپرست کو اس بات کی بھی اجازت دیتا ہے کہ اُن کے مال کے تحفظ و فروغ کی وجہ سے اگر اسے اتنا وقت نہ ملے کہ وہ اپنی روزی کما سکے تو وہ بقدرِ ضرورت و کفایت اُن کے مال میں سے استعمال کر سکتا ہے:

(۱) وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا ..... وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ۔

(۲) مَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ

تعجب ہے کہ مسلمانوں کی آسمانی کتاب کو تو یتیموں کی فلاح و بہبود کا اس قدر اہتمام ہو لیکن خود مسلمانوں کے معاشرے میں ان کا کوئی پرسانِ حال نہ ہو۔ وہ یا تو اُن سفاک لوگوں کی ستم رانیوں کا شکار ہیں جو اُن کی جائداد کو ہضم کرنا چاہتے ہوں یا وہ ڈاکوؤں، چوروں، جیب کتروں اور دوسرے سماج دشمن عناصر کی صحبت میں پڑ کر امن و امان کا مسئلہ بنے رہیں یا کچھ عیار لوگ اُن کے نام پر دارالیتامیٰ کھول کر بسوں اور گاڑیوں میں اُن سے بھیک منگواتے رہیں۔ سارے ملک کے اندر معتدبہ تعداد میں ایسے سرکاری یا غیر سرکاری ادارے نہ ہوں جہاں وہ اپنی صلاحیتوں کے مطابق نیچی سے اونچی تعلیم اور ادنیٰ سے اعلیٰ ہنر حاصل کر سکیں اور معاشرتی لحاظ سے ایسا مقام حاصل کر لیں کہ سہاروں والے بھی ان پر رشک کریں۔ جس ملک میں ان کم سن بے کسوں کے ساتھ یہ سلوک کیا جا رہا ہو اور جہاں ان کی اس ننگِ انسانیت

حالتِ زار کے مناظر شب و روز عام دیکھنے میں آتے ہوں، میں نہیں سمجھتا کہ اس ملک کے باشندے کس منہ سے اپنے آپ کو ایک اسلامی ملک کے باشندے کہلاتے ہیں اور اپنے آپ کو قرآن پاک کے حامل تصوّر کرتے ہیں۔

غلام | آج تو شاید یہ لفظ ایک متمدّن معاشرے کے لئے غیر مانوس بلکہ ناقابلِ برداشت ہو، مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ تاریخ کا ایک دور ایسا بھی گزرا ہے (اور اسے گزرے ہوئے کچھ زیادہ عرصہ بھی نہیں ہوا) کہ یہ طبقہ نہ صرف موجود تھا بلکہ محروم و مظلوم ترین طبقہ تھا۔ بہت سے نام نہاد فلسفوں اور مذاہب نے اسے ایک ناگزیر ضرورت قرار دیا تھا۔ ہر ملک، ہر مذہب اور ہر معاشرے میں غلام نہ صرف موجود تھے بلکہ ان کا مال مویشی کی طرح وسیع پیمانے پر کاروبار ہوتا تھا۔ یہودیوں اور ہندوؤں کی مذہبی کتابوں میں مختلف وجوہات کی بنا پر کسی بھی شخص کو غلام بنایا جا سکتا تھا۔ الغرض انسانی معاشرہ کے اس طبقہ کی دُنیا پر چاروں طرف گھٹا ٹوپ اندھیرے چھائے ہوئے تھے۔ لیکن آفتابِ جہاں تابِ اسلام کے طلوع ہوتے ہی یہ تاریکیاں چھٹنے لگیں۔ قرآنِ حکیم نے چھوٹتے ہی اعلان کر دیا کہ: اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّ اُنْثٰی .... اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ۔ کہ تمام انسان چاہے ان کی رنگتیں، بولیاں اور قومیتیں کتنی ہی مختلف کیوں نہ ہوں، ایک ہی مرد اور عورت کی اولاد ہیں۔ لہٰذا انسانیت کے ناطے سے سب برابر ہیں۔ غلام ہونے سے کوئی آدمی چھوٹا اور آزاد ہونے سے کوئی آدمی بڑا نہیں ہو جاتا۔ بڑا وہ ہے جس کا کردار بڑا ہے۔ قرآن کا یہ پہلا کڑکا تھا، جس نے ذہنوں میں گڑے ہوئے مولائی و آقائی کے پہاڑوں کو خاشعًا متصدّعًا کر دیا۔ اور پھر اُسی کی صدائے بازگشت تھی حاملِ قرآن صلّی اللہ علیہ وسلّم کا وہ اعلان جو آپ نے حجۃ الوداع کے موقع پر سارے جاہلی امتیازات کی نفی کرتے ہوئے فرمایا کہ: کلکم بنو آدم و آدم من تراب۔ قرآن اور حاملِ قرآن کی دی ہوئی اکرامِ انسانیت کی یہی تعلیم تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے ایک عظیم قریشی گورنر کو ڈانٹتے ہوئے پوچھتے ہیں: متی استعبدتم الناس وقد ولدتھم امھاتھم احرارًا۔

قرآنِ حکیم نے صرف اس اعلان اور تعلیم پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ معاشرے میں پہلے سے موجود اس لعنت کو دور کرنے کے لئے مختلف اقدامات کئے۔ چنانچہ سب سے

پہلے تو قرآن حکیم کا مطالعہ کرتے ہوئے آپ محسوس کریں گے کہ سارے قرآن میں کسی کو غلام بنانے کا کہیں حکم نہیں دیا گیا اور نہ ہی اس کی کوئی صورت بتائی گئی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ہر انسان کو فطرۃً آزاد تسلیم کرتا ہے اور اُن کی غلامی کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ کفّار سے جنگ کے نتیجے میں قیدیوں کو غلام بنانے کی ایک صورت اگرچہ اسلام میں ناگزیر حالات کی وجہ سے معمول بہا رہی ہے۔ مگر قرآن حکیم نے اس کی صراحت نہ کرکے اور اس کے بارے میں بھی سکوت اختیار کرکے اپنا منشاء ظاہر کردیا ہے کہ بہرحال یہ صورت اسے مرغوب و محبوب نہیں۔ ان اقدامات میں سے ایک اقدام یہ بھی تھا کہ غلام کو آزاد کرنا ایک بہت بڑی نیکی قرار دیا۔ چنانچہ فرمایا کہ :۔ فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ وَمَا أَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ فَكُّ رَقَبَةٍ۔ اس ترغیب کا نتیجہ یہ ہوا کہ نبی علیہ السّلام اور آپ کے صحابہؓ نے بے شمار غلام لوگوں سے خرید خرید کر آزاد کرنے شروع کردیئے۔ دوسرا اقدام یہ کیا کہ جنگ میں قیدیوں کو فدیہ لے کر یا احساناً (بلا معاوضہ) چھوڑنے کا حکم دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر جنگوں میں حضورؐ نے قیدیوں کو غلام بنائے رکھنے کی بجائے آزاد کردیا۔ ارشادِ خداوندی ہے : حَتّٰى اِذَا اثْخَنْتُمُوهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَاءً۔ اگر کوئی شخص اپنے غلام کو فی سبیل اللہ آزاد نہیں کرسکتا اور غلام کے پاس اپنی قیمت ادا کرنے کے لئے رقم موجود ہے یا وہ اس کا انتظام کرسکتا ہے تو مالک کو اسے قیمت لے کر آزاد کرنے کا حکم دیا۔ اسے اسلام کی اصطلاح میں مکاتبت کہتے ہیں۔ قرآن مجید کا حکم ہے :

"وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا وَّاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰىكُمْ"

قسم، ظہار، قتلِ عمد اور قتلِ خطا وغیرہ جرائم کا ایک کفّارہ یہ بھی مقرر کیا کہ غلام آزاد کئے جائیں۔ دوسرے مذاہب کے برخلاف آزاد انسانوں کے مقابلہ میں غلاموں کے لئے جرائم کی سزائیں نصف کی حد تک کم رکھیں اور اُن کے فرائض میں بھی تخفیف کردی۔ یہ رویّہ اسلام کے اس جذبۂ ترحّم و شفقت کا پتہ دیتا ہے جو وہ غلاموں کے متعلق اپنے اندر رکھتا ہے۔ مصارفِ زکوٰۃ کی ایک مدّ غلاموں کو آزاد کرانے کے لئے مخصوص کردی اور اس طرح غلاموں کی آزادی کو حکومت یا پورے معاشرہ کی ذمّہ داری بنا دیا۔

مشرک مرد اور عورت چاہے وہ ظاہری اور مادّی لحاظ سے کتنے ہی پُرکشش کیوں نہ ہو، کے مقابلے میں مومن غلام یا کنیز کو بہتر اور افضل قرار دے کر ان سے مسلمانوں کو نکاح کرنے کی ترغیب دی اور اس طرح اس معاشرتی دیوار میں شگاف ڈال دیا جو آزاد اور غلام کے درمیان حائل تھی۔ اس سلسلے کی درخشاں مثال رسولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے خود اس طرح پیش کی کہ قریش کے اونچے گھرانے کی ایک عورت ــ حضرت زینبؓ ــ کا نکاح اپنے ایک سابق غلام حضرت زیدؓ سے کر دیا اور اس سلسلہ میں اٹھنے والے طوفانِ طعن و تشنیع کی قطعاً پرواہ نہ کی۔ اس کے بعد یہ باب ایسا وا ہوا کہ غلاموں کے حوصلے بلند ہوئے اور انہوں نے بلا حجاب قریش کے اعلیٰ خاندانوں میں نکاح کے پیغام دیئے اور وہ قبول ہوئے۔

قرآنِ حکیم کی پیدا کردہ احترامِ انسانیت کی یہی وہ روح تھی جس کے پیشِ نظر حضورؐ نے غلاموں کے لئے عبد اور اُن کے مالکوں کے لئے مولیٰ اور ربّ کے الفاظ کا استعمال ممنوع قرار دے دیا اور اُن سے حسنِ سلوک کا حکم دیتے ہوئے فرمایا:

"ھم اخوانکم جعلھم اللہ تحت ایدیکم فمن کان اخوہ تحت ایدیہ فلیطعمہ مما یاکل ولیلبسہ مما یلبس ولا یکلفہ ما یغلبہ فان کان مما یغلبہ فلیعنہ ــ

میں اس فرمانِ نبوی کا ترجمہ کئے بغیر آگے نہیں بڑھنا چاہتا تاکہ عربی نہ جاننے والے بھی اس کا مفہوم سمجھ لیں اور دیکھیں کہ اسلام کی تعلیم کتنی بلند ہے اور کس بے دردی سے ہم نے اس کو نظر انداز کر رکھا ہے۔ حضورؐ کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ یہ غلام (کوئی گھٹیا مخلوق نہیں بلکہ) تمہارے ہی بھائی بند ہیں جنھیں اللہ نے تمہارا زیردست بنا دیا ہے پس تم میں سے جس کے ماتحت کوئی ایسا انسان ہو اسے چاہیئے کہ اسے اسی کھانے میں سے کھلائے جو وہ خود کھا رہا ہے اور اسی قسم کا لباس پہنائے جو وہ خود پہن رہا ہے اور اس پر کام کا اتنا بار نہ ڈالے جس کے تلے وہ دب کر رہ جائے۔ اگر سوئے اتفاق سے ایسا کوئی کام دے دیا ہے تو پھر خود بھی اس کا ہاتھ بٹائے۔ پیغمبرِ اسلام کی اس تعلیم پر تو سر دھننے مگر ان کے نام لیواؤں کے طرزِ عمل پر اپنا سر پیٹ لیجئے۔

قرآنِ حکیم اور حاملِ قرآن کی اس تعلیم ہی کا نتیجہ تھا کہ ہمارے اسلاف نے غلاموں کو

بیٹوں کی طرح پالا اور اپنی بیٹیاں ان کے نکاح میں دے دیں۔ یہ امتیاز غالباً صرف مسلمان قوم کو حاصل ہے کہ اس کی تاریخ میں برِّصغیر پر خاندانِ غلاماں اور مصر پر خاندانِ ممالیک (جو غلاماں ہی کا مترادف ہے) مدتوں حکمران رہے اور مسلمانوں نے ان کی بالکل اسی طرح جان و دل سے اطاعت کی جس طرح وہ کسی بڑے سے بڑے خاندانی حکمران کی کرتے تھے۔

اسلام نے معاشرے میں غلام کا مرتبہ اتنا اونچا کر دیا تھا اور غلاموں نے اس حوصلہ افزا فضا میں اپنی صلاحیتوں کو اس طرح چمکایا کہ بنی اُمیّہ کا مغرور خلیفہ عبدالملک بن مروان اس وقت سر بہ گریباں رہ گیا جب اسے بتایا گیا کہ اس وقت مکّہ، یمن، مصر، شام، جزیرہ اور بصرہ وغیرہ مرکزی شہروں کی علمی سیادت، عطاء بن ابی رباح، طاؤس بن کیسان، یزید بن صہیب، مکحول بن مہران، ضحاک بن مزاحم اور حسن بن ابوالحسن جیسے غلاموں یا غلام زادوں کو حاصل ہے۔ جنگِ موتہ کی مہم میں خود آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ایک غلام زادے اُسامہ بن زید کو سپہ سالار بنا کر اور بڑے بڑے قریشی زعماء کو اُن کے زیرِ کمان دے کر غلاموں کے احساسِ کہتری کو مٹانے، سادات و کبرا کے احساسِ برتری کو کچلنے اور انسانی حرّیت و مساوات قائم کرنے کی ایک نہ بھولنے والی مثال قائم کر دی۔

آج اگرچہ غلامی کے آثار مٹ چکے ہیں، تاہم نام کی تبدیلی کے ساتھ یہ لعنت اب بھی موجود ہے۔ قرآنِ حکیم نے عظمت و احترامِ انسانیت کی جو تعلیم دی تھی اگر اسے قائم رکھنا ہے تو ہمیں غلاموں کے اس طبقے کے ساتھ جو اس دور میں ملازمین، خدّام اور محنت کش کے نام سے مشہور ہے، ہمیں اپنا رویّہ بدلنا ہوگا۔ حضورؐ کے اس فرمان کو ایک دفعہ پھر اپنے ذہنوں میں تازہ کیجیے کہ وہ: "تمہارے بھائی ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے تمہارے ماتحت کر دیا ہے۔ پس تم میں سے جس شخص کے ماتحت اگر کوئی ایسا شخص ہو تو اُسے چاہیے کہ اسے وہی کھانا کھلائے جو خود کھاتا ہے، وہی لباس پہنائے جو وہ خود پہنتا ہے اُسے ایسا کام نہ دے جو اُس کی استطاعت سے زیادہ ہو اور اگر ایسا کر بیٹھے تو پھر خود بھی اس کی مدد کرے!"

یہ ملازم و خدّام اور یہ محنت کش بھی تو ہمارے ہی بھائی ہیں جنھیں گردشِ زمانہ نے

ہمارے ماتحت کر دیا - کاش ! ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مذکورہ بالا فرمان سے روشنی حاصل کریں، اُسے اپنا اُسوہ بنائیں - اگر ہمارے دلوں میں قرآنِ حکیم کی تعلیم کا کچھ بھی پاس ہے اور ہمارے نزدیک اُسوۂ رسولؐ کی کچھ بھی اہمیّت ہے۔ تو ہمیں چاہیئے کہ ہم ان لوگوں کے مشاہرے، معاوضے اور شرائطِ کار و ملازمت طے کرتے وقت اس فرمانِ نبویؐ کو مشعلِ راہ بنائیں، ان کے مشاہرے اتنے ہوں کہ وہ ہم سا لباس پہن سکیں اور ہم سا کھانا کھا سکیں انہیں گدھے اور بیل سمجھ کر ان کی پیٹھ پر بوجھ کا آخری تنکا بھی نہ ڈال دیں - بلکہ

انہیں انسان تصوّر کرتے ہوئے، اُن کی اوسط استعداد کے مطابق انہیں کام دیں اور اُن کی قوّتِ کارکردگی کو قائم اور مسلسل رکھنے کے لئے ان پر اتنا بوجھ نہ ڈالیں کہ وہ قبل از وقت دم توڑ دیں بلکہ انہیں آسائش و آرام کا موقع بھی دیں اور سب سے ضروری بات یہ ہے کہ ہمارا ان سے سلوک ایسا ہو جیسا ایک شریف انسان کا کسی معزز انسان کے ساتھ ہوتا ہے بلکہ مسلمان ہونے کے ناطے اس میں اخوت بھائی چارے اور اپنائیت کی روح کارفرما ہونی چاہیئے۔ مگر یہ جبھی ممکن ہے کہ سرمایہ دار آجر کے ذہن سے یہ بات نکل جائے کہ اس کا سنہری یا روپہلی سکّہ محنت کش کے سرخ خون سے افضل ہے اور وہ محنت کو بھی اتنی اہمیّت و فوقیت دینے لگے، جتنی وہ اپنے دھات کے سکّوں یا کاغذ کے نوٹوں کو دیتا ہے اور وہ کام کرنے والے کو نوکر اور اپنے آپ کو آقا سمجھنا بند کر دے اور فریقین کے اس تعامل کو باہمی تعاون تصوّر کرے۔ جب تک سرمایہ دار (آجر) کے ذہن میں یہ انقلاب نہیں آتا، یہ ملازم یہ خدّام، یہ محنت کش بیسویں صدی کے غلام بنے رہیں گے اور غلامی کی ہر قسم کو مٹانے کا قرآنی مقصد شرمندۂ تعبیر رہے گا۔

فقراء و مساکین | معاشرے کے ان محروم طبقوں میں سے ایک طبقہ اُن لوگوں کا بھی ہے جن کے پاس وسائلِ معیشت ان کی بنیادی ضروریات سے بھی کم ہوتے ہیں۔ محرومین کے اس طبقہ کے متعلق قرآنِ حکیم کا رویّہ کیا ہے۔ یہ معلوم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم پہلے یہ دیکھیں کہ دولت اور دولت مندوں کے متعلق اس کا

نقطۂ نظر کیا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ دولت کو قرآن مجید میں بعض مقامات پر فضل اور خیر سے تعبیر کیا گیا ہے اور واقعتہً اس کے فضل و خیر ہونے میں اس وقت کوئی شک و شبہ نہیں رہتا جب اس کا اکتساب بھی صحیح طریقوں سے ہو اور اس کا انفاق بھی صحیح مصارف پر۔ تاہم قرآن مجید نے ہی بتایا ہے کہ عملاً دولت کے اثرات انسانی سیرت پر بڑے گہرے اور مہلک ہوتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ دولت سے اکثر و بیشتر انسانی طبائع میں غفلت، سنگدلی، استغنا، استکبار، استہزا، بخل، قبول حق سے انکار اور ارتکاب جرائم و معاصی جیسے امراض پیدا ہوتے ہیں۔ مشتے نمونہ از خروارے:

(۱) اَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰی وَکَذَّبَ بِالْحُسْنٰی فَسَنُیَسِّرُہٗ لِلْعُسْرٰی

(۲) اِنَّ الْاِنْسَانَ لَیَطْغٰٓی اَنْ رَّاٰہُ اسْتَغْنٰی

(۳) اِنَّھُمْ کَانُوْا قَبْلَ ذٰلِکَ مُتْرَفِیْنَ وَکَانُوْا یُصِرُّوْنَ عَلَی الْحِنْثِ الْعَظِیْمِ

(۴) اَنْ کَانَ ذَا مَالٍ وَّبَنِیْنَ، اِذَا تُتْلٰی عَلَیْہِ اٰیٰتُنَا قَالَ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ ۝

(۵) اَلْھٰکُمُ التَّکَاثُرُ ۝ حَتّٰی زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۝

(۶) بَلْ قُلُوْبُھُمْ فِیْ غَمْرَۃٍ مِّنْ ھٰذَا وَلَھُمْ اَعْمَالٌ مِّنْ دُوْنِ ذٰلِکَ ھُمْ لَھَا عَامِلُوْنَ حَتّٰٓی اِذَآ اَخَذْنَا مُتْرَفِیْھِمْ اِذَا ھُمْ یَجْئَرُوْنَ۔

(۷) فَذٰلِکَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ...
..... وَیَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ۝

(۸) قَالُوْا لَمْ نَکُ مِنَ الْمُصَلِّیْنَ وَلَمْ نَکُ نُطْعِمُ الْمِسْکِیْنَ۔

(۹) وَذَرْنِیْ وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِیْدًا وَّجَعَلْتُ لَہٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا.....
... کَلَّآ اِنَّہٗ کَانَ لِاٰیٰتِنَا عَنِیْدًا

انبیائے کرام کو جھٹلانے والے اور ان کی دعوت سے انکار کرنے والے عموماً یہی سرمایہ دار ہوتے ہیں۔ قرآن حکیم کہتا ہے: (۱) ذَرْنِیْ وَالْمُکَذِّبِیْنَ اُولِی النَّعْمَۃِ (۲) وَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَۃٍ مِّنْ نَّذِیْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْھَآ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِہٖ کٰفِرُوْنَ وَقَالُوْا نَحْنُ اَکْثَرُ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِیْنَ ۝ (۳) کُلُوْا

وَتَمَتَّعُوْا قَلِيْلًا اِنَّكُمْ مُّجْرِمُوْنَ ۝

سرمایہ داری کے ان اثراتِ بد کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ چند سرمایہ داروں کا ذکر جس انداز میں کیا ہے، اُس کا حال بھی سُن لیجئے۔ فرعون نے موسیٰ علیہ السّلام کی دعوت کو یہی کہہ کر ٹھکرا دیا تھا کہ میں مصر کے تمام وسائلِ معیشت کا مالک اور یہ مدّعیٔ نبوّت بھوکا اور کنگلا، بھلا میں اس کی اطاعت کیسے قبول کرلوں: قَالَ اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝ — قارون بھی اسی کا ایک درباری تھا، جس کے پاس مال و دولت کے دو انبار تھے کہ بقولِ قرآن، اُس کے خزانوں کی چابیاں اٹھانے کے لئے بھی ایک جتھا چاہیئے تھا مگر وہ یہ دولت عوام پر خرچ کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ وہ کہتا تھا کہ اس میں خدا کا کیا دخل اور عوام کا کیا حق ہے۔ یہ تو میں نے اپنی لیاقت سے حاصل کی ہے: اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ۔

پھر ایک باغ والے (گویا جاگیردار) کا ذکر کیا کہ وہ اپنی دولت کے نشّے میں قیامت ہی سے منکر تھا۔ وہ اپنے غریب ساتھی سے کہتا تھا کہ اوّل تو قیامت ویامت کوئی شے نہیں اور اگر بالفرض ہوئی بھی تو میں وہاں بھی تم سے اچھا رہوں گا: "مَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً وَّلَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا — گویا دولت نے اس کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی تھی کہ وہ اپنی صلاحیتوں اور استحقاق کی بنا پر وہاں بھی آسودگی اور خوش حالی کا اسی طرح مستحق ہے جس طرح یہاں پر، اور غریب جس طرح یہاں محروم ہے وہاں بھی ایسا ہی رہے گا۔ حضرت شعیب علیہ السّلام کی سرمایہ دار، کاروباری قوم نے ان سے کہہ دیا تھا کہ تمھاری ان نمازوں وغیرہ کا ہمارے کاروبار سے کیا واسطہ؟ ہم ہر قسم کی پابندی سے آزاد معیشت کے مالک ہیں: اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا۔ قومِ عاد اتنی سرمایہ دار تھی کہ ہر پُرفضا مقام پر بلاضرورت کوٹھیاں اور محلّات تعمیر کر رکھے تھے، جن میں ہر وقت دادِ عیش دیتے رہتے تھے: اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ۔ اسی افراطِ دولت نے ان کو تکذیبِ پیغمبر پر اکسایا جس کے نتیجے میں انہیں ہلاک کر دیا گیا: فَكَذَّبُوْهُ فَاَهْلَكْنٰهُمْ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ط

افراد و اقوام کے ذکر کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے اِن بستیوں کا بھی ذکر کیا ہے جن کو ذرائع پیداوار کی کثرت نے اس قدر مدہوش کر دیا کہ خدا کے باغی بن گئے اور انجام کار تباہی سے دوچار ہوئے۔ اُن کی سونا اُگلنے والی زمین جھاگ اور بول اگلنے لگی : وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا۔ قرآن مجید تو یہاں تک کہتا ہے کہ قوموں اور بستیوں کی تباہی کا باعث یہ سرمایہ دار ہی بنتے ہیں۔ کیونکہ فسق و فجور کے امام اور لیڈر بن کر پوری قوم کو کردار کے بحران میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ ارشادِ خداوندی ہے : اِذَا اَرَدْنَا اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا — اور آخر میں یہ بھی سن لیجیے کہ قرآن حکیم کا یہ لرزا دینے والا فرمان بھی سرمایہ داروں ہی کے بارے میں ہے کہ : اَلَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ

دولت اور دولت مندوں کے اس ذکرِ خیر کے بعد آیئے اس طبقہ کی طرف جنھیں قرآن حکیم فقراء و مساکین کے نام سے یاد کرتا ہے۔ سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس فقر و مسکنت سے نکالنے کا کیا اہتمام کیا ہے :

(۱) دولت پر زکوٰۃ لازم کی تو اس کا اوّلین مصرف انہی کو قرار دیا : — اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ۔

(۲) مالِ غنیمت اور فَے وغیرہ میں ان کا حصّہ رکھا : وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى۔

(۳) زکوٰۃ و صدقاتِ واجبہ کے علاوہ بھی اغنیاء کے اموال میں ان کا حق ٹھہرایا : فِيْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ۔ لفظِ حق کو خاص طور پر نوٹ کریں کیونکہ حق وہ ہوتا ہے جو واجب الادا ہو۔

(۴) اغنیاء کو انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب دینے کے لئے رکوع کے رکوع وقف کر دیئے، بلکہ یہاں تک کہہ دیا کہ : لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ کہ جب تک خدا کی محروم مخلوق کو اپنی محبوب ترین اشیاء نہیں دے دیتے، تمہارے نیکوکاری کے دعوے غلط ہیں۔ انفاق فی سبیل اللہ کی تاکید کے ساتھ انہیں متنبّہ کر دیا گیا کہ اگر انہوں نے ان فقراء و مساکین پر احسان دھرنے یا ان صدقات

کی آڑ میں انہیں ذہنی و جسمانی اذیت دینے کی کوشش کی یا انہیں گھٹیا قسم کی اشیاء دے کر حاتم کی قبر پر لات مارنا چاہی تو سارے کئے دھرے پر پانی پھر جائے گا۔ مقصد یہ تھا کہ فقراء و مساکین کی عزتِ نفس مجروح نہ ہو۔ اگرچہ اسلام کسی کے سامنے دستِ سوال دراز کرنا پسند نہیں کرتا لیکن قرآن نے انہیں صراحت کے ساتھ منع نہیں کیا تاکہ ان کے دل نہ دکھیں، صرف اشارے کنائے سے سمجھایا ہے۔ اغنیاء کو تنبیہ کر دی گئی کہ اگر کسی تہیدست کو تم سے کام آپڑا ہے تو ماتھے پہ تیوری چڑھا کر یا اسے جھڑک کر اس کے آبگینۂ دل کو ٹھیس نہ پہنچاؤ: اَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ ــــ !!

(۵) اللہ تعالیٰ کو فقراء و مساکین کی بہبود کس قدر محبوب و مقصود ہے، اس کا اندازہ سورۂ بقرہ کی اس آیت سے کیجئے جس میں لوگوں کے اس سوال کا ذکر ہے کہ وہ کیا کچھ خرچ کریں؟ حضورؐ کو حکم دیا جاتا ہے کہ اُن سے کہو جو کچھ بھی تمہاری ضروریات سے فاضل ہے، وہ ان پر خرچ کر دو: يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ ــــ !!!

(۶) اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اقتصادیات کے دو ایسے زرّیں اُصول وضع کر دیئے جن سے ارتکاز دولت کے سارے سوتے ہی خشک ہو جائیں اور دولت کا بہاؤ تیز بھی ہو جائے اور کثیر الاطراف بھی۔ پہلا اصول یہ بتایا کہ تمہارا معاشی نظام ایسا ہونا چاہیئے کہ "كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَاءِ" کہ دولت ہر پھر کر صرف چند سرمایہ داروں کے ہاتھ میں جمع نہ ہوتی رہے اور دوسرا اصول یہ بتایا کہ "اَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ" ــ کہ تم اپنی دولت کے ایسے مالک نہیں جو مختارِ مطلق ہو بلکہ اس پر خدا کے امین ہو، اس کی مرضی کے مطابق، اس کی محروم مخلوق پر تقسیم کرنی پڑے گی۔

سارے قرآن کو پڑھ جائیے، سرمایہ داروں کے ذکر کے برخلاف آپ کو کسی ایک محروم الانسان کے کردار کی مذمت نہیں ملے گی، حالانکہ ان میں بھی ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو اللہ تعالیٰ نے اُن کی کوتاہیوں کو مجبوری پہ محمول کرتے ہوئے ان کو نظر انداز کر دیا ہے یا اُن کا ذکر کر کے اللہ تعالیٰ نے اُن کے

احساسِ محرومی پر نمک پاشی کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس کے برعکس قرآنِ حکیم نے ایک خاص واقعہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ریکارڈ کر دیا اور فقراء و مساکین جتنا چاہیں اس پر فخر کر سکتے ہیں کہ ایک فقیر و مسکین شخص عبداللہ ابن اُمِّ مکتوم۔ سے اعراض برتنے اور نام نہاد بڑوں پر زیادہ توجّہ دینے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب پیغمبر پر بھی اظہارِ خفگی فرمایا۔

ہماری آبادی کا بیشتر حصّہ انہی فقراء و مساکین پر مشتمل ہے۔ کیونکہ فقہاء اور ائمۂ لغت کے نزدیک فقیر وہ ہے جس کے پاس وسائلِ معیشت ہوں لیکن ضرورت سے کم ہوں اور مسکین وہ ہے جس کے پاس سرے سے کوئی ذریعۂ معاش نہ ہو یا بالعکس اور ہمارے عوام کی اکثریت انہی دو کی ذیل میں آتی ہے۔ قرآنِ حکیم کا اسلوبِ بیان پکار پکار کر بتا رہا ہے کہ اُس کا رُجحان کس طرف ہے۔ ہمارے علماء، سیاسی جماعتوں، رہنماؤں، ملکی معیشت کی منصوبہ بندی کرنے والوں کو چاہیئے کہ قرآنِ حکیم کے تیوروں کو پہچانیں، اُس کے اشاروں کو سمجھیں اور اپنے سیاسی منشور یا ملک کے میزانیے تیار کرتے وقت ان فقراء و مساکین کی فلاح و بہبود اور ان کی آسودگی و خوش حالی کو زیادہ سے زیادہ اہمیّت دیں۔ ملک کے لئے ایسا نظامِ معیشت وضع کریں جس سے قرآنِ حکیم کا یہ مقصد پورا ہو۔ ایسا اقتصادی ڈھانچہ جس میں ایک ہی شخص پہلے ایک جاگیردار کی حیثیت سے آدھے پاکستان کا مالک بنے اور اپنے مزارعین کا خون نچوڑ کر درآمد و برآمد پر قابض ہو جائے اور اس سے کمائے جانے والے منافع سے کارخانے پر کارخانے لگاتا چلا جائے اور آخر کار اپنی بے پناہ دولت کے زور پر لوگوں کے ووٹ خرید کر حکمران کی حیثیت سے پورے ملک کے وسائلِ معیشت پر قابض ہو جائے اور اس طرح دولت ہر طرف سے ہر پھر کر اُسی کی تجوریوں میں جمع ہونے لگے۔ (ایسا اقتصادی ڈھانچہ) "کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَۃً ۢ بَیْنَ الْاَغْنِیَاءِ" کی صریحًا ضد اور روحِ قرآن کے سراسر خلاف ہے۔

بے شک اسلام طبقاتی کش مکش کا قائل نہیں لیکن آپ نے سطورِ بالا سے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ اُس کا جھکاؤ کس طرف ہے۔ اس لئے اگر اس دور میں جب کہ معیشت نے غیر معمولی اہمیت اختیار کر لی ہے اور نوبت: کاد الفقر ان یکون

کفرًا تک آ پہنچی ہے۔ قرآنِ حکیم کے اس رویّہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان محروم طبقوں کے مفاد کو اولیت دیں تو یہ اسلام کی ایک بہت بڑی خدمت ہوگی۔ کیا فقراء و مساکین کو ہمیشہ کے لئے فقراء و مساکین رہنے دینا ہی اسلام ہے، ہرگز ہرگز نہیں۔ نہ یہ اسلام ہے نہ منشائے قرآن کے مطابق۔

یہ بات بھی علمائے کرام اور مفکرین اسلام کے سوچنے کی ہے کہ قرآنِ حکیم کے ان احکام اور ان کی تفصیل و تبیین میں آنے والے رسول اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ارشادات کو جنھیں ہم اب تک صرف اخلاقیات کی ذیل میں شمار کرتے رہے ہیں، قانون کی صو[رت] دی جائے۔ ارتکازِ دولت اور تکاثر کا صدیوں پرانا مرض محض وعظوں اور اخلاقی اپیلوں سے دور نہیں ہوگا۔ قرآن و سنّت کی اس اسپرٹ کو مدِنظر رکھتے ہوئے ایسے ضوابط مدوّن ہونے چاہئیں جن سے یہ تقاضے پورے ہوتے ہوں۔ تاکہ خدا و رسول کے احکام صرف کتابوں کی زینت بن کر نہ رہ جائیں۔ خدّام و عمّال کو وہ معاشرے میں کارفرما بھی نظر آئیں۔ اسلامی شریعت کے ان تقاضوں کو پورا کرنے کے بعد اگر کوئی آجر انہیں مزید سہولتیں اور آسائشیں مہیا کرتا اور ان کے ساتھ بھائیوں کا سا سلوک کرتا ہے تو یہ اس کا حسنِ اسلام ہوگا۔ لیکن ارتکازِ دولت کو کم سے کم کرنے اور فقراء و مساکین کو خوش حالی کی سطح تک لانے والے احکام قرآن و سنّت کو قانونی شکل دے کر ان کی پابندی ضروری اور ان کی خلاف ورزی خلافِ قانون قرار دی جائے۔ ان پر عمل صرف سرمایہ داروں کے جذبۂ خیرسگالی پر نہ چھوڑا جائے۔

حرفِ آخر حضرات! ہمارے معاشرے کے ان محروم طبقوں کے بارے میں قرآنِ حکیم کی روش کو بیان کرتے وقت نہ تو میں نے کسی استنباط و اجتہاد سے کام لیا ہے اور نہ اس کی تمام تفصیلات میں جانے کی کوشش کی ہے۔ میں نے اس کے صرف سادہ اور صریح احکامات کا ذکر کیا ہے۔ اس گفتگو سے میرا مقصد اربابِ علم و دانش کی توجہ اس رویّہ کی طرف دلانا تھا جو قرآنِ حکیم نے ان کی فلاح و بہبود، اصلاح و ترقی سے متعلق اختیار کیا ہے اور وہ مقصد و مدّعا بیان کرنا ہے جو وہ اس سلسلے میں اپنے سامنے رکھتا ہے۔ تو میری ان گذارشات کو سننے کے بعد اگر آپ سمجھتے ہیں کہ میں نے اسے

صحیح سمجھا ہے اور واقعی قرآنِ حکیم کے نازل کرنے والے کا مقصد و منشاء یہی ہے کہ ہم ان لوگوں پر احسان کرنا، انہیں امام و پیشوا بنانا، زمین کے وسائل معیشت میں ابتداءً حصہ دلانا چاہتے ہیں تو قرآنِ حکیم، اس کے نازل کرنے والے اور اس کے لانے والے کا واسطہ دے کر کہوں گا کہ اصحابِ فکر و دانش کو بالعموم اور علمائے دین کو بالخصوص اس سلسلے میں اپنے فرض کو محسوس کرنا چاہیئے۔ وہ نہ صرف اس کے لئے اپنی طاقتور آواز بلند کریں بلکہ اپنی متفقہ رائے سے معاشرے میں ایسی انقلابی تبدیلیاں لانے کی تدابیر بھی پیش کریں تاکہ یہ محروم طبقات اپنی زندگی ہی میں اپنی کھلی آنکھوں سے نہ صرف دیکھ لیں بلکہ محسوس بھی کر لیں کہ ہاں واقعی اسلام ہم بے نواؤں کا حامی و بہی خواہ ہے اور اُن کی جڑ پکڑتی ہوئی یہ غلط فہمی دور ہو جائے کہ دوسرے مذاہب کی طرح یہ مذہب بھی اور اس کے علمبردار بھی سرمایہ داروں کے ایجنٹ، فقراء و مساکین کے دشمن اور انہیں لوریاں دے دے کر سلانے والے ہیں۔

اور اگر آپ کا خیال ہے کہ میں نے قرآنِ حکیم کے منشاء کو غلط سمجھا ہے، طبقۂ نسواں واقعی اسی کا مستحق ہے کہ اس کو ہمیشہ جوتے تلے رکھا جائے۔ یتیم اسی قابل ہیں کہ وہ دربدر کی ٹھوکریں کھاتے اور مٹی میں رُلتے رہیں۔ غلاموں کے ان چھوٹے بھائیوں یعنی ملازمین، خدام اور محنت کشوں کا مقدر یہی ہے کہ وہ موت و حیات کے درمیان لٹکتے رہیں۔ وہ لنڈے کے کپڑوں سے اپنے بدن ڈھانکیں، فٹ پاتھ کی دال روٹی سے اپنے پیٹ پالیں اور رات کو کسی جوہڑ یا سڑک کے کنارے بنی گھاس پھونس کی جھونپڑیوں میں پڑے رہیں اور انہی حالات میں یہ ان لوگوں کے کاروبار میں بیلوں کی طرح جتے رہیں جو گردشِ زمانہ سے اونچی کرسیوں پر جا بیٹھے ہیں۔ کیونکہ اگر یہ لوگ خدا کے چہیتے نہ ہوتے تو انہیں یہ رُتبہ ہائے بلند کیوں ملتے۔ اسی طرح یہ فقراء و مساکین بھی ہمارے معاشرے کا ایک ناگزیر عنصر ہیں۔ اُن کو تا ابد قائم رہنا چاہیئے تاکہ ہماری گلیاں اُن کی صدائے "فی سبیل اللہ" سے گونجتی رہیں اور اُن کی پھیلی ہوئی ہتھیلیوں پر دو چار سکے رکھ کر دولت مندوں کے جذبۂ اظہارِ دولت کی تسکین ہوتی رہے۔ حضرات! اگر ایسا ہے تو پھر میں اپنی اس آدھ پون گھنٹہ کی جسارت اور آپ کی سمع خراشی پر معافی چاہتا ہوں اور اتنی دیر تک آپ کو جو زحمتِ سماعت دی ہے، اُس پر معذرت خواہ ہوں۔ شکریہ! اللّٰھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلاً وارزقنا اجتنابہ۔

قرآن مجید۔ اِک نسخۂ کیمیا

جناب اختر الواسع

قرآنِ حکیم ایک نسخۂ شافی ہے جو آج سے تقریباً چودہ سو برس سے زائد عرصہ قبل بیمارِ انسانیت کے دکھوں کا مداوا کرنے والے قادرِ مطلق کی طرف سے اپنے برگزیدہ پیغمبر خاتم المرسلین حضرت احمد مجتبیٰ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے توسط سے بھیجا گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دکھیاری انسانیت کفر و شرک، ظلم و شقاوت، جبر و استبداد، بے جا رسوم و رواج، ناجائز اطوار، غلط عادات، غیر اخلاقی روایات اور توہمات کے مہلک جراثیم سے پیدا شدہ ناسور کا شکار تھی۔ جنت سے بھیجے گئے آدمؑ کے بیٹوں نے دنیا کو بھی جہنم بنا دیا تھا اور اس پر ستم یہ کہ خسارے کے اس بیوپار میں مست بھی تھے اور نازاں بھی۔ اب وہی رستے تھے یا تو ستم رسیدہ، مظلوم اور درد سے بلکتی انسانیت خودکشی کی حرام موت مرے۔ یا پھر کوئی نسخۂ کیمیا عالمِ وجود میں آئے، جس سے اس کے دکھوں کا مداوا ہو اور وہ صحت مند ہو کر ایک نئی زندگی پائے تاکہ نئی منزلوں کی طرف اک نئے سفر کا آغاز کر سکے۔

بلاشبہ حقیقی تعظیم اور سچے شکر کی مستحق صرف ذاتِ باری تعالیٰ ہے کہ اس ارحم الراحمین نے "دعاءِ خلیلؑ" اور "نویدِ مسیحاؑ" کی شکل میں اپنے محبوب نبیٔ آخر الزماں علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بھیجا اور ساتھ میں اس کتابِ برحق کو نازل فرمایا جو وادیٔ ظلمات میں منارۂ نور، صراطِ مستقیم کی طرف لے جانے والی رہنما، جادۂ حق کے راہ نوردوں کو کامیابی کی دلیل، غمزدوں اور زندگی سے مایوس افراد کے لئے حوصلہ اور ظفرمندی کی بشارت اور ایک مکمل ضابطۂ حیات کی اساس بن کر آئی۔

انسانی تاریخ اس کی گواہ ہے کہ غارِ حرا کا گوشہ نشینؐ سوئے قوم جو پیغام لے

کر آیا تھا، اُس نے وہ روشنی پھیلائی جس نے بھٹکے ہوئے لوگوں کو صحیح راہ پر لگایا، گمراہوں کو ہدایت بخشی، غریبوں کو سہارا دیا، غلاموں، پست اور کمزور اقوام کو بلندی اور طاقت عطا کی، بے کسوں اور بے بسوں کا مددگار بنا، مردہ قوموں کو نئی زندگی بخشی اور رحمت کے پیغام کو عام کیا۔ اس نے ایک ایسے خدا پرست سماج کی بنیاد رکھی جس میں "ایک سجدہ" کے ذریعے انسان کو "ہزاروں سجدوں" کی لعنت سے چھٹکارا ملا۔ جس نے عقائد و عبادات اور اخلاق و معاملات کے تمام مبادیات کو غیر مبہم انداز سے لوگوں کی فلاح و بہبود کے لئے واضح کر دیا اور پھر زمانہ نے دیکھا کہ نیم وحشی افراد نے ایک عظیم الشان سماج کی بنیاد ڈالی، ایک شاندار تہذیب کی تشکیل کی اور ایک قابل رشک ثقافت سے دنیا کو متعارف کرایا۔ کل کے اُجڈ اور جاہل اس پیغام پر عمل پیرا ہونے کے بعد ایک عالم کے معلّم بن گئے اور علوم و فنون کی انہوں نے نئی دنیائیں آباد کر کے اس نوید باری تعالیٰ کو اپنے دور کی ترقی اور ضرورت کے اعتبار سے عملی طور پر صحیح ثابت کر دیا کہ:

"اللہ نے سب چیزوں کو جو آسمان اور زمین میں ہیں تمہارے تصرف میں دے دیا ہے اور اس نے تم کو تمام ظاہری اور باطنی نعمتوں سے نوازا ہے"!

(پ: ۲۱، ع: ۱۲)

آج اس تاریخی پس منظر کا مطالعہ کرنے کے بعد جو رفیع الشان بھی ہے اور تابناک بھی جب ہم اپنے ہم عصر معاشروں پر نظر ڈالتے ہیں اور دیدہ ریزی، اور وسعتِ نظر کے ساتھ آج کی دنیا کی "رفتارِ ترقی" کا بھرپور جائزہ لیتے ہیں تو یہ سوال ابھر کر سامنے آتا ہے کہ میکانکی اور طبیعیاتی سطح کی ساری ترقیوں کے باوجود اگر انسانی قلب و روح ہمہ گیر امن کی بشارت کے لئے ایک پیاسے کی طرح تڑپ رہے ہیں تو اس "ترقی" کی معنویت کیا باقی رہ جاتی ہے؟

آج ذہنِ انسانی پر مسلط ہونے والی شے ہے وہ عالمی کرب جس نے مدبروں، مفکروں، دانشوروں اور مصلحوں کو یکساں عاجز کر رکھا ہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جہاں قرآنِ کریم صبحِ بیداری کی پہلی کرن بن کر پھوٹتا ہے۔ چونکہ قرآنی مطمحِ نظر کی روشنی میں عقلِ انسانی اپنی واماندگی کا عجز و اخلاص کے ساتھ اعتراف کرے تو وحیِ الٰہی کی نعمت

اس کے لئے وجہ فیضان بن جاتی ہے۔ لیکن المیہ یہ ہے کہ دانشوروں کی بنیاد درماندہ تو ہے، درماندگی کی معترف نہیں۔ اس لئے ہمارے علوم اور ہماری زندگی نظریوں ذیلی نظریوں اور ان کی بوجھل تشریحوں کی آماجگاہ بنے ہوئے ہیں۔ گویا جیسے ہدایت کا نور ہونا چاہیئے وہ ذہن و ضمیر کے لئے ناقابلِ برداشت بوجھ بن گیا ہے۔ علم کی اس گمراہ کن رہنمائی سے نجات صرف "وحیِ الٰہی" کی بدولت ہی ہو سکتی ہے۔ اس لئے کہ وہاں ایک ایسی مکمل روشنی ملتی ہے جو حیات و کائنات کے ذرّہ ذرّہ کو نکھا کر سامنے لے آتی ہے۔ پھر نہ ظن و قیاس کے اندھیرے باقی رہ جاتے ہیں نہ کم نظری کا اندیشہ۔

قرآن کریم نظریہ سے پہلے ایمان دیتا ہے اور اسی لئے نظریہ، ایمان کی طاقت کی بدولت زندگی کا پورا سفر پامردی کے ساتھ طے کر سکتا ہے اور انسانی تماج "ستاروں کی گذرگاہوں کو ڈھونڈنے" اور "سورج کی شعاعوں کو گرفتار" کرنے کے ساتھ ہی ساتھ اپنے افکار کی دنیا میں سفر کرنے کے لئے ایک ایسی "صراطِ مستقیم" بھی پالیتا ہے جو نہ صرف منزل تک پہنچنے کی امین ہے۔ بلکہ جس پر چلنے والوں کو ربِّ کریم کی نعمتوں کا حقدار ہونے کی "نویدِ ربّانی" بھی دی گئی ہے۔

اب جب مسلم معاشرہ پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوتا ہے کہ پوری ملّتِ اسلامیہ انتشار و افتراق، کرب و بے چینی اور پریشانی و زبوں حالی کا شکار ہے۔ آج اسلامی معاشرے کے افراد کی حالتِ زار یہ ہے کہ نہ ان میں یک جہتی ہے اور نہ ہم خیالی نہ وہ ہم مقصد ہیں اور نہ ہم آہنگ۔ وہ تسبیح کے ٹوٹے ہوئے دانوں کی طرح بکھرے ہوئے ہیں۔ غرض شاعرِ مشرق کے بقول ؎

محبت کا جنوں باقی نہیں ہے ؏ مسلمانوں میں خوں باقی نہیں ہے
صفیں کج، دل پریشاں سجدے بے ذوق ؏ کہ جذبِ اندروں باقی نہیں ہے

مسلمان اپنے مرکز سے بہت دور جا چکے ہیں۔ اس مرکز سے کہ جس سے ان کی تمام عبادات، معاملات، معاشرت، تمدن، تہذیب نیز اجتماعی اور اقتصادی نظام وابستہ ہیں۔ وہ مرکز جس پہ کہ ان کی تمام اخلاقی اور روحانی برتری اور بزرگی کا دار و مدار ہے اور وہ مرکز ہے قرآنِ پاک

"سمجھانے والی اور یاددہانی ہر اس بندہ کے لئے جو (خدا کی طرف) رجوع کرے!" (س: ق، ر: ۱)

کتاب بن کر نازل ہوا۔ جس کا بھیجنے والا خود فرما رہا ہے کہ:

"یہ (قرآن) ایک کتاب مبارک ہے جو ہم نے تمہاری طرف نازل کی تاکہ لوگ اس کی آیات پر تدبّر کریں اور سمجھ دار لوگ نصیحت حاصل کریں!"
(س: ص، ر: ۳)

یعنی قرآن صرف دعاؤں کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک مکمّل اور جامع قانونِ زندگی کی حیثیّت رکھتا ہے۔ وہ قرآن پاک جو کہ جواں مردی، بے باکی، حق گوئی، راستبازی کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ جو ایثار، خودداری، حلم و مروّت، اور محبّت و شفقت کی تعلیم دیتا ہے۔ جو کہ انسانوں کے لئے ایک بہترین رہنما ہے۔ تاریخ عالم شاہد ہے کہ جب بھی مسلمانوں نے اس کی تعلیمات کی روحانی قیادت میں کسی جانب رخ کیا، دشمنوں کی صفیں جو پہاڑ کی طرح مضبوط تھیں، دم کے دم الٹ گئیں اور کفر و شرک کے مضبوط قلعے مفتوح و سرنگوں ہو کر حق و صداقت کا پرچم اڑانے لگے۔ انہوں نے روحِ قرآنی کی مشعل کو ہاتھ میں لے کر جب بھی کسی وادیٔ پرظلمت کی جانب اپنے گھوڑوں کی باگیں موڑ دیں، تردّد و تذبذب اور شک و شبہ کی تاریکیاں خود بخود چھٹتی چلی گئیں اور پھر وہاں ایمان و ایقان کا آفتابِ جہاں تاب اس شان سے طلوع ہوا کہ: ؏ "عالم تمام مطلعِ انوار ہو گیا!"

اس کے برعکس جب بغض و عناد، حرص و ہوس اور طمع و حسد کی ابلیسی سازش کی جکڑ بندی میں آ کر ان کو قرآنِ حکیم سے بُعد ہونا شروع ہوا تو ان کی روحِ ایمانی بھی درماندہ ہونے لگی اور آج اس کے نتائج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ ۔ (اقبال)

تمدّن، تصوّف، شریعت، کلام ؛ بتانِ عجم کے پجاری تمام
حقیقت خرافات میں کھو گئی ؛ یہ امّت روایات میں کھو گئی
بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے ؛ مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

اور یہ سب کچھ یوں ہی نہیں ہو گیا بلکہ اس کی وعید قرآن مجید میں بہت پہلے دے دی

گئی تھی کہ :

"زمانہ (تاریخ انسانی) اس بات پر شاہد ہے کہ انسان ہمیشہ خسارے اور گھاٹے میں رہے، سوائے ان کے جو ایمان لائے اور عمل صالح کئے اور ایک دوسرے کو حق بات کی اور مشکلات میں ثابت قدم رہنے کی صلاح دیتے رہے!" ..... (سورۂ عصر)

آج اس سورۂ پاک کی تفسیر ہر صاحب بصیرت اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ یہی وہ مرکز فکر و عمل تھا کہ جس کے ذریعہ عرب کے بادیہ نشینوں نے قیصر و کسریٰ کو اپنا مغلوب بنا لیا۔ لیکن آج اس مرکز سے دور ہو جانے کا انجام یہ ہے کہ عظیم الشان سلطنتوں کے مالک اسرائیل کے مٹھی بھر لوگوں کے ہاتھوں ذلت و خواری کا شکار ہیں۔ وہ جن کا کل تک زمانہ تابع تھا، وقت جن کے اشاروں پر گردش کر رہا تھا، آج خود زمانہ کے تابع اور گردش دوراں کا شکار ہو کر رہ گئے ہیں۔ بقول اقبالؒ ؎

اے لا الٰہ کے وارث باقی نہیں ہے تجھ میں ❊ گفتارِ دلبرانہ کردارِ قاہرانہ
تیری نگاہ سے دل سینوں میں کانپتے تھے ❊ کھو یا گیا ہے تیرا جذبِ قلندرانہ

جارج برناڈ شا جو اسی بیسویں صدی کے ایک مشہور مغربی فکر، ادیب اور ڈرامہ نگار تھے، سے منسوب یہ روایت بڑی شرم و غیرت دلانے والی ہے کہ ایک بار کسی نے شا سے پوچھا کہ "آپ نے دنیا میں سب سے اچھی چیز کیا دیکھی؟" انہوں نے فوراً جواب دیا: "اسلام" سوال کرنے والے نے پھر پوچھا کہ اور: "وہ کون سی چیز ہے جسے آپ نے زندگی میں سب سے برا پایا؟" برناڈ شا نے بلا توقف جواب دیا "مسلمان" برناڈ شا کے بولے ہوئے یہ دو چھوٹے چھوٹے لفظ بڑے معنی خیز ہیں آپ خود ہی ایمان و انصاف کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر فیصلہ کیجئے کہ دنیا کی کسی بھی قوم کی اس سے بڑھ کر بدقسمتی اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس کے پاس دنیا کی سب سے زیادہ سچی کتاب موجود ہو، مگر اس نے اسے جزدانوں میں لپیٹ کر طاقِ نسیاں کی زینت بنا دیا ہو۔ جس کے پاس آبِ حیات کا چشمہ ہو مگر وہ خود ایک قطرہ سے محروم اور پیاسی ہو۔ جس کے پاس تمام دنیا کے دکھوں کا علاج ہو مگر وہ خود اپنی بیماری دور نہ کر سکے غرض مسلمان تو وہ درماندۂ قسمت ہیں جو دعویٰ تو کرتے ہیں نور کی پرستاری کا اور بھٹکتے

ہیں ظلمتوں کے پیچھے۔

آج مسلمانوں کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ وہ اللہ کے پاکیزہ کلام کو محض تعویذ کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک حیاتِ نو کی بشارت دینے والے اس پیغامِ برحق کا سب سے بہتر استعمال اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ جب کوئی سکراتِ موت کے عالم میں ہو تو سورہ یٰسین پڑھ کر اس کے لئے موت آسان بنا دی جائے یا چند آیات کی تلاوت کر کے زندگی بھر کی غفلتوں کی تلافی کر دی جائے اور یا پھر کسی کرایہ کے حافظ کو مامور کر کے ایصالِ ثواب کے لئے قرآن خوانی کرا دی جائے۔

قرآن مجید کا علم رکھنے والے تمام اصحاب یہ جانتے ہیں کہ اللہ کا یہ سارا کا سارا کلام خطاب کی شکل میں ہے، جس کا مخاطب ہم میں سے ہر شخص ہے۔ اس کی ہر آیت ہمارے لئے مشعلِ راہ اور سرچشمۂ ہدایت ہے مگر ہم نے اس کو سمجھنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ یہی ہماری کم نصیبی ہے کیونکہ رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہرؒ کے بقول:

"کلامِ پاک ریشم کے جزدانوں اور الماریوں کے بالائی حصّوں اور وہاں کے گرد و غبار کے لئے آسمان سے نازل نہیں ہوا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ قرآنِ پاک کا ہر ایک نسخہ اس کثرت سے مستعمل ہو کہ پنسل کے نشان، کاغذ کی پٹیاں، بین الاوراق یہاں تک کہ انگوٹھے اور انگلیوں کے نشان ہر جگہ نظر آئیں اور ثابت کر دیں کہ اس کتاب سے زیادہ اس کے ماننے والے کسی کتاب کو نہیں پڑھتے، نہ اس سے زیادہ کسی کتاب کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں!"

قرآن شریف میں سورۂ بقرہ کی پہلی آیت ہی میں واشگاف انداز سے اعلان کیا گیا ہے کہ:

"بے شک یہ ایک کتاب ہے جو ان لوگوں کے لئے ہدایت کا پیکر ہے، جن کے دلوں میں خدا کا خوف ہو!"

معلوم ہوا کہ قرآنِ کریم صرف اپنی فصاحت و بلاغت کا سکّہ جمانے کے لئے نازل نہیں ہوا بلکہ یہ زندگی کے ہر شعبے میں ہماری رہبری اور رہنمائی کرنے کے لئے بھیجا گیا ہے۔ مشہور

مستشرق پروفیسر ہربرٹ وائل نے اس حقیقت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے:

"قرآن اخلاقی ہدایتوں اور دانائی کی باتوں سے بھرا ہوا ہے اور قرآن نے عالم انسانیت کی زبردست اصلاح کی ہے۔ جن اشخاص نے اس کے مضامین پر غور کیا ہے وہ اس بات کو سمجھ سکتے ہیں کہ وہ ایک مکمل قانونِ ہدایت ہے۔ انسانی زندگی کی کوئی سی شاخ لے لیجئے ناممکن ہے کہ اس شعبہ میں اس کی تعلیم رہنمائی نہ کرتی ہو۔ میرا خیال یہ ہے کہ اگر اس کی تعلیمات پر عمل کیا جائے تو ایک سمجھدار آدمی بیک وقت دنیوی اور روحانی ترقی حاصل کر سکتا ہے!"

ان حقائق کے باوجود ہمارا حال یہ ہے کہ زبان سے بلند و بانگ دعوے کرنے کے باوجود ہم اس کی عظمت کو آج تک سچے معنوں میں اپنے دل میں نہ اتار سکے اور اگر یہ بات غلط ہے تو بتلائیے کہ کیا وجہ ہے کہ یہی وہ قرآن ہے جس کی چند آیتوں نے عرب کے ایک بڑے شاعر لبید کو اتنا متاثر کیا کہ وہ مسلمان ہوگیا۔ ارادۂ قتل نبی صلی اللہ علیہ وسلم (نعوذ باللہ) سے نکلنے والے عمر ابن خطاب کو فاروقِ اعظمؓ بنا دیا اور حبش کے دربار میں نجاشی کی ماہیتِ قلب کچھ سے کچھ کر دی ـــــ آج ہماری حالت کو بدلنے میں ہمارا مددگار کیوں نہیں ہوتا ـــ؟ آج ہماری یہ حالت کیوں ہے کہ؟

ذکرِ عرب کے سازمیں، فکرِ عجم کے ساز میں ∴ نے عربی مشاہدات، نے عجمی تخیلات
قافلۂ حجاز میں ایک حسین رضؓ بھی نہیں ∴ گرچہ ہے تابدار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات

اس تلخ حقیقت کا سراغ اور اس پریشان کن سوال کا جواب وہی ہے جو اسی لاہور کے "دانائے راز" نے برسوں پہلے دیا تھا کہ ؎

تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو کتاب خواں ہے، مگر صاحبِ کتاب نہیں

تو پس اگر ہم اس قعرِ ذلت سے نکلنا چاہتے ہیں، زمانے کی تابعداری اور وقت کے جابرانہ چنگل سے نجات چاہتے ہیں، انتشار و افتراق سے محفوظ ہونے کے خواہاں ہیں، عزت، وقعت، غیرت و خودداری اور حمیت کے ساتھ زندگی کے طالب ہیں تو پھر ہمیں اپنے بھولے ہوئے مرکز کی طرف آنا ہوگا۔ مرکز کی متعین راہوں پر اپنے کھوئے ہوئے گوہرِ مقصود کو پانے کے لئے قرآن کریم کے بتائے ہوئے اصولوں کو اپنانا ہوگا

اس کے علاوہ دوسرا کوئی راستہ نہیں۔

آج جب کہ چودھویں صدی ہجری رخصت ہونا چاہتی ہے اور پندرھویں صدی ہجری کی آمد کی چاپ کے ساتھ مسلم معاشرہ کے دروازہ پر اس کی دستک بھی سنائی دینے لگی ہے اور دنیا کے مختلف گوشوں میں اسلام، اسلام کی آوازیں اور نشأۃ ثانیہ کا غلغلہ سا بلند ہو رہا ہے، ان تمام مسلمانوں سے جو دینی رہنمائی تعلیم اور شعائرِ اسلام کی پاسبانی کے دعویدار ہیں اقبالؒ کی زبان میں قرآن کا یہ مطالبہ کانوں سے سنا اور ضمیر و عقل کے ذریعے اس کی معنویت، ضرورت اور اہمیت کو سمجھا جا سکتا ہے کہ ؎

اے پیرِ حرم رسم و رہِ خانقاہی چھوڑ ٭ مقصود سمجھ میری نوائے سحری کا!
اللہ رکھے تیرے جوانوں کو سلامت ٭ دے ان کو سبق خود شکنی، خود نگری کا
تو ان کو سکھا خارا شکافی کے طریقے ٭ مغرب نے سکھایا انہیں فن شیشہ گری کا

آج اس بات کی گزرے ہوئے کل سے زیادہ ضرورت ہے کہ اقبالؒ کی آواز پر لبیک کہا جائے اور ایسی عملی کوششیں کی جائیں جن سے قرآن فہمی کا ذوق عام ہو۔ "خود شکنی" اور "خود نگری" کے سبق پڑھائے اور "خارا شگافی" کے طریقے سکھائے جائیں اور صرف مسلمانوں کو ہی نہیں بلکہ پورے عالمِ انسانیت کو۔ اس لئے اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں اسلامیات کے ایک معمولی اور ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے یہ تجویز رکھنا چاہوں گا کہ "قرآنی ذوق" اور "قرآنی فہم" کو عام کرنے کیلئے ہمیں ایک ایسا مراسلاتی نصاب دنیا کی تمام بڑی بڑی زبانوں میں مختلف مراحل کا تیار کرنا چاہیئے جس کے ذریعے ہم قرآن کریم کے درس و حکمت والے قصوں، بنیادی تصورات اور تعلیمات سے ان تمام لوگوں کو جو آج کسی بھی مذہب کی پیروی کے باوجود حق اور امن و سکون کے متلاشی ہیں، متعارف کرا سکیں تاکہ وہ بھی قرآنی بصیرت سے بہرہ ور ہو سکیں اور ہم ان لوگوں میں شامل ہو سکیں جو نہ صرف: "ایمان لاتے، عملِ صالح کرتے بلکہ دوسروں کو بھی حق بات کی اور مشکلات میں صبر سے کام لینے کی صلاح دیتے ہیں" اور اس طرح اپنے آپ کو ہر قسم کے "خسارہ" اور ہر طرح کے "گھاٹے" سے محفوظ رکھتے ہیں۔ اس طرح ہم

قرآنی تعلیمات اور ہم

خواجہ غلام صادق

دیں مراپا سوختن اندر طلب ❊ انتہائش عشق و آغازش ادب
آبروئے گل ز رنگ و بوئے اوست ❊ بے ادب، بے رنگ و بو، بے آبروست
نوجوانے را چو بینم بے ادب ❊ روز من تاریک می گردد چو شب
تاب و تب در سینہ افزاید مرا ❊ یادِ عہدِ مصطفےٰ آید مرا
از زمانِ خود پشیماں می شوم ❊ در قرونِ رفتہ پنہاں می شوم

یہ اشعار 'جاوید نامہ' سے لئے گئے ہیں۔ ان میں علامہ اقبال نئی نسل سے مخاطب ہیں۔ مگر جس حقیقت کی طرف ان اشعار میں اشارہ کیا گیا ہے، نصف صدی گزرنے کے بعد بھی وہ جوں کی توں ہے۔ دین سے وابستگی کا تقاضا سوختن اندر طلب ہے۔ دین کا ادب و احترام اس کا نقطۂ آغاز ہے۔ یہ ادب و احترام فرد کا مستقل رویہ بن جائے، طلبِ صادق کا عمل تیز تر ہو جائے تو عشق کا ظہور ہوتا ہے اور یہ دین سے وابستگی کی آخری حد ہے۔ علامہ اقبال نے نوجوانوں کے بے ادب ہونے پر گہرے دکھ اور رنج کا اظہار کیا ہے۔ دین کے احکام اپنانے اور انہیں فروغ دینے کے لئے اوّلین شرط مذہب کے بارے میں وہ ذہنی رویہ پیدا کرنا ہے جسے ادب و احترام کا نام دیا جاتا ہے۔ اس شرط اوّل کے پورا ہونے سے قبل دین کے احکام کو انفرادی اور اجتماعی سطحوں پر دل سے قبول کرنے اور اپنانے کے بارے میں پُرامید ہونا عمل کی نفسیات سے چشم پوشی کرنے مترادف ہے۔ گویا یہ ایک خوابِ خوش کی پرورش کرنے کے سوا کچھ نہیں۔ بلاشبہ موجودہ حکومت کے دورِ اقتدار میں ذرائع ابلاغ سے اسلامی موضوعات پر درس و تدریس، خطبات و تقاریر اور مضامین و مذکرات کا اہتمام پہلے کی نسبت زیادہ ہو گیا ہے۔ تاہم جہاں تک انفرادی اور اجتماعی زندگی میں قرآنی تعلیمات

اپنانے کا تعلق ہے، ابھی تک اس میں کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہیں ہوئی یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم قرآنی تعلیمات کیوں نہیں اپناتے؟ زبانی دعووں میں تو ہم پیش پیش ہیں لیکن عملاً زندگی کے ہر شعبے میں ہم ابھی اپنی منزل سے بہت دُور ہیں۔

گذشتہ اڑھائی سو برس سے اس خطۂ ارض میں اسلام کی شمع روشن رکھنے کی خاطر ہماری دینی تنظیموں، دینی درسگاہوں اور تحریکوں نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ نامساعد حالات میں انہوں نے مسلسل قربانیاں دے کر اشاعت اسلام کا کام جاری رکھا ہے۔ ہندی مسلمانوں پر ان کے احسانات تاریخ کا سنہری باب ہیں۔ ان تنظیموں اور اداروں کے بغیر برّصغیر پاک و ہند میں اسلام کو اسی صورتِ حال سے دوچار ہونا پڑتا، جس کا سات سو برس کے سیاسی عروج کے بعد ہسپانیہ میں اسے سامنا کرنا پڑا تھا۔ اہل مدرسہ گلا پھونٹ رہے ہیں لیکن مسجد کے میناروں سے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کی صدا بلند ہوتی رہی اور حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ ط کی اس پکار کا اس دُنیا میں اجر، دیگر نعمتوں کے علاوہ ہمیں پاکستان کی صورت میں ملا۔ اسلام سے وابستگی کا یہ صلہ اجرِ غیر ممنون کی ایک ہلکی سی جھلک اپنے اندر لئے ہوئے ہے [قائداعظمؒ نے بجا فرمایا تھا کہ پاکستان اُسی روز معرضِ وجود میں آگیا تھا جس روز پہلا شخص مسلمان ہوا تھا۔]

جیسا کہ مَیں نے پہلے عرض کیا، جہاں تک اسلامی تعلیمات کی تدریس کا تعلق ہے، ہمارے دینی مدارس، بعض تعلیمی ادارے اور تنظیمیں اس سلسلے میں مسلسل جدّوجہد کرتی رہی ہیں۔ مگر اس ساری تگ و دو کے باوجود عملی زندگی میں قرآنی تعلیمات کا رنگ گہرا نہیں ہو سکا۔ یہ بہت بڑا المیہ ہے لہٰذا اس کے عوامل کی نشاندہی ہمارے لئے لازم ہے۔ درحقیقت ہمیں ایسی سیاسی اور معاشرتی تبدیلیوں کی اشد ضرورت ہے جو ہمارے معاشرے کو قرآن و سنّت کے قریب تر لائے اور ہمارے ملک کو حقیقی معنوں میں اسلامی اور فلاحی مملکت بنا دے۔ اس سلسلے میں اہلِ وَرَع کی اس مجلس میں مجھے چند گذارشات پیش کرنی ہیں۔

میں ایک ایسے شخص کے ذکر سے آغاز کرنا چاہتا ہوں جو کسی باقاعدہ مذہب کا حامل نہ ہوتے ہوئے بھی حقیقی معنوں میں مذہبی تھا۔ مذہب کا حامل یا پیرو ہونے اور مذہبی ہونے میں بہت زیادہ فرق ہے۔ آگے چل کر میں اس کی وضاحت کروں گا۔

معزز سامعین!

میں جس شخص کا ذکر کر رہا ہوں وہ کسی بڑے مذہب کا علمبردار نہیں تھا۔ مگر اسے زندگی کے اپنائے ہوئے اصولوں کی صداقت پر یقین کامل تھا۔ ان اصولوں سے انحراف اس کے لئے محال تھا۔ میرا اشارہ حکیم سقراط کی طرف ہے جو آج سے پچیس سو سال پہلے یونان کے شہر ایتھنز کا رہنے والا تھا۔ اس کا قول تھا کہ علم نیکی ہے۔ اس کے نزدیک اگر آپ کو صحیح علم میسّر ہو تو آپ لازماً اس پر عمل پیرا ہوں گے۔ بدی، گناہ اور جرم کا ارتکاب جہالت یا لاعلمی کی بنا پر ہوتا ہے۔ سچائی اس قدر طاقتور ہے کہ جھوٹ اس کے سامنے نہیں ٹھہر سکتا۔ سقراط زندگی بھر سچائی کا پرچار کرتا رہا۔ موقع پرست حکمران طبقہ کو اس کی یہ حرکت ناگوار گزری۔ کیونکہ ان کے نزدیک مصلحتِ وقت کا خیال رکھنا زندگی میں کامیابی کے لئے ایک زرّیں اصول تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سچائی کے شیدائی سقراط پر نوجوانوں کو گمراہ کرنے کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا۔

عدالت نے سقراط کے خلاف فیصلہ دیا کہ وہ نوجوانوں کا کردار بگاڑتا ہے لہٰذا وہ اپنے نظریات کا پرچار بند کر دے یا زہر کا پیالہ پی کر موت کی آغوش میں چلا جائے۔ سقراط نے حق و صداقت کی خاطر جان کا نذرانہ دینے کو ترجیح دی۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ جیل میں سقراط کے بعض شاگردوں نے اسے فرار ہونے کا مشورہ دیا۔ مگر سقراط نے ایسا کوئی مشورہ قبول نہ کیا۔ اس نے انتہائی اطمینان سے قید خانے میں زہر کا پیالہ پی کر زندگی ختم کر لی۔ مرزا غالبؔ نے ایک جگہ کہا ہے ؎

"جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد ❊ پر طبیعت اِدھر نہیں آتی!"

سقراط کا یہ قول کہ اگر آپ کو صحیح معرفت ہو تو آپ لازماً نیکی کی راہ پر

گامزن رہیں گے اور غالب کا اقرار کہ طاعت و زہد سے آگاہی کے باوجود طبیعت نیکی پر مائل نہیں ہوتی، متضاد قول ہیں لہٰذا ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ان دونوں باتوں کے پس پردہ کیسی نفسیات کارفرما ہے۔

ابھی میں نے مذہبی لگاؤ کی دو صورتوں کا ذکر کیا تھا۔ پہلی صورت کسی مذہب کا حامل ہونے سے عبارت ہے۔ دوسری صورت کا تعلق مذہبی ہونے سے ہے۔ پہلی صورت میں مذہب ایک کاروباری رشتے کی طرح سیاسی سماجی اور نجی منفعت کے لئے صرف نام کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ پاسپورٹ یا شناختی کارڈ بنانے کے لئے ملازمت حاصل کرنے کے لئے، شادی کے موقع پر نکاح نامہ میں اندراج کے لئے ہم اسے بروئے کار لاتے ہیں۔ اس صورت میں مذہب ایک خول ہے جس کی اساس ایمان پر استوار نہیں ہوئی، گویا وہ ایک سماجی سہولت ہے۔ حالات بدل جائیں تو اس خول کو بھی بدلا جا سکتا ہے۔ غالب کے مندرجہ بالا شعر میں مذہبی اعتقادات کو اسی حوالے سے بیان کیا گیا ہے۔ مذہبی صداقتیں کسی یقین پر استوار نہ ہوں تو وہ عمل پر اثر انداز نہیں ہوتیں۔ اس کے برعکس مذہبی ہونا ایک جہانِ نو تخلیق کرنے کے مساوی ہے۔ مزید براں اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ انسان اس کی تمام ذمہ داریاں قبول کرے۔ سقراط کی زندگی میں ہمیں اس کی مثال ملتی ہے۔

معزز سامعین!

یاد رکھئے کہ مذہبی صداقتوں کو دل کی گہرائیوں سے قبول کرنا ہی حقیقی معنوں میں صاحبِ ایمان ہونا ہے۔ اگر آپ ایمان کی دولت سے مالا مال ہیں تو آپ کے مذہبی نظریات اور رجحانات آپ کے اعمال سے عیاں ہوں گے۔ عمل عقیدہ اور ایمان کی خارجی صورت ہے۔ ایمان اور عمل میں یگانگت خودی کی پختگی کی علامت ہے۔ عمل کے بغیر ایمان کی تکمیل نہیں ہوتی۔ سورۂ حجرات میں اعراب کے بارے میں واضح ہدایت موجود ہے:

"یہ بدوی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے۔ ان سے کہو کہ تم ایمان نہیں لائے بلکہ یوں کہو کہ ہم مطیع ہو گئے۔ ایمان ابھی تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا ہے۔ اگر تم اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری اختیار کر لو تو وہ تمہارے اعمال کے

اجر میں کوئی کمی نہیں کرے گا۔ یقیناً اللہ بڑا درگذر کرنے والا اور رحیم ہے۔ حقیقت میں تو مومن وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے۔ پھر انہوں نے کوئی شک نہ کیا اور اپنی جانوں اور مالوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا' وہی سچے لوگ ہیں۔" (۱۵ : ۱۴-۶۹)

مذہبی صداقتوں کو دل سے قبول کرنا ہی مذہبی ہونے یعنی مذہبی طریق سے زندگی بسر کرنے کی ضمانت ہے [سقراط نے علم نیکی ہے کا مژدہ سناتے ہوئے علم کو تیقّن کی وہ فعّال حالت تصوّر کیا تھا جسے ہم آج کی زبان میں ایمان کہتے ہیں] اگر ہم قرآنی تعلیمات پر عمل پیرا نہیں تو سورۂ حجرات کی مندرجہ بالا آیات کا اطلاق ہمارے اوپر بھی ہوتا ہے۔ قرآن کانفرنس میں ہمیں اس صورتِ حال کا سنجیدگی سے تجزیہ کرنا چاہیئے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایمان کس طرح دلوں میں داخل ہو کہ ہم قرآنی تعلیمات پر مکمل طور پر عمل پیرا ہو جائیں۔ علامہ اقبال نے تشکیلِ الٰہیاتِ جدید میں ایک جگہ ایمان کی جو تعریف کی ہے، اس سے ایمان ایک ایسے عقیدے کی صورت میں سامنے آتا ہے جو ایک واضح مگر نادر تجربے پر استوار ہوتا ہے۔ علامہ کے الفاظ یہ ہیں کہ :

"ایمان سے مطلب یہ نہیں کہ ہم چند ایک قضیوں کو بے چون وچرا مان لیں۔ اس کے برعکس یہ تیقّن اور اعتماد کی وہ کیفیت ہے جس کے لئے انسان کو بڑی نادر واردات سے گزرنا پڑتا ہے۔ صرف مضبوط شخصیتوں کے مالک لوگ ہی اس تجربے سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔" (ص ص ۹-۱۰۸)

علامہ خود ہی فرماتے ہیں کہ جس ایمان کی بنیاد مشاہدۂ حق پر ہو ایسے ایمان کے اہل بہت کم لوگ ہوتے ہیں۔ اس میں خدا کے فضل کے ساتھ ساتھ صاحبِ ایمان کی اپنی کاوش کو بھی بہت عمل دخل ہوتا ہے۔ مگر ایک عام شخص تو اس قسم کے مشاہدہ کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

ایمان جن مذہبی صداقتوں پر استوار ہوتا ہے' انہیں جملوں میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ ان تصوّرات و تعقّلات کو اپنانے کے لئے کسی نمونہ کی ضرورت

ہوتی ہے ؎

آگ اس کی پھونک دیتی ہے برنا و پیر کو ÷ لاکھوں میں ایک بھی ہو اگر صاحب یقین

کرداری نمونے کے قول و فعل میں مطابقت، دل اور زبان کی موافقت سے ایسی شہادت میسّر آتی ہے جس سے لوگوں کے دل سوزِ یقین سے گرم ہوتے ہیں اور سینے نور ایمان سے منوّر ہو جاتے ہیں۔ حضور نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی حیاتِ طیّبہ، آپ کا اُسوۂ حسنہ تمام لوگوں کے لئے ایک ایسا نمونہ ہے جس کے مطالعے سے ہماری زندگی میں عظیم انقلاب لایا جا سکتا ہے۔ ادب، احترام اور محبت کے جذبات سے سرشار ہو کر نوجوان اگر نبی آخرالزّماں کی طرف رجوع کریں تو کایا پلٹ سکتی ہے۔ زندگی کے عام شعبوں میں ہمارے ہاں EXEWERS نہیں رہے۔

تیسری صورت مذہبی صداقتوں پر غور و فکر کرنے اور ان کے لئے دلائل اور استدلال مہیّا کرنے سے عبارت ہے۔ یہ کام علمائے کرام اور سکالرز سرانجام دیتے ہیں۔ ہمارے ہاں علم کی تقسیم کچھ اس طرح ہوئی ہے کہ اکثر علماء نے اپنے آپ کو صرف دینوی علوم کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ جب کہ سکالرز سائنسی علوم کے لئے وقف ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس تقسیم سے اِبلاغ کا ایک خلا پیدا ہو گیا ہے۔ عام تعلیمی اداروں میں سائنس کی طرف ہی توجّہ دی جاتی ہے اور مذہب سے متعلق یا مذہبی امور کے بارے میں معلومات تشنگی کے ذیل میں آتی ہیں۔ نہ گھر میں مذہبی ماحول نہ درس گاہوں میں مذہبی تعلیم کا اہتمام اور نہ ہی اسلامی رنگ میں رنگنے کے لئے کوئی تربیت گاہ، ایسی صورت میں مذہبی تصوّرات اور عقائد چند ایسے جملوں کی صورت میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ جنہیں رواج اور عادت کے تحت زبان سے ادا کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہم مذہب کے حامل تو بن جاتے ہیں مگر عملِ صالح کی سعادت سے محروم رہتے ہیں۔ جو کچھ زبان سے ادا کرتے ہیں اس کی تصدیق قلب سے نہیں کرتے۔ اسی سے دل کی نامحکمی پیدا ہوتی ہے۔ کسی حد تک اس صورتِ حال کی ذمّہ داری ہمارے نظامِ تعلیم پر عائد ہوتی ہے۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اساتذہ بھی بری الذّمّہ نہیں ہیں۔ مشرق و مغرب کے علوم سے آگاہی

درسِ قرآن اور تعمیرِ حیات

ڈاکٹر عبد الرؤف

اللہ تعالیٰ نے بنی نوعِ انسان کو جن ان گنت نعمتوں سے نوازا ہے ان میں قرآن حکیم سب سے بیش بہا نعمت ہے۔ یہ عظیم کتاب ہدیٰ انسانی فکر و کردار میں ایک تخلیقی انقلاب کا باعث بنی۔ چنانچہ غور و فکر کرنے اور سیرت و کردار سنوارنے سے متعلق قرآنِ حکیم میں مندرج بنیادی ضابطوں کے زیرِ اثر ایک ایسی فعّال اُمّت معرضِ وجود میں آئی جو نوعِ انسانی کے لئے باعثِ رحمت ثابت ہوئی۔ اس میں قطعی شائبہ نہیں کہ اگر خدانخواستہ یہ آخری صحیفۂ مطہّرہ نازل نہ ہوا ہوتا تو ہماری اس کائنات کا نقشہ کہیں مختلف ہوتا۔

قرآن حکیم سے متعلق حقیقت اور افسانہ آزادی کے بعد پاکستان میں قرآنی تعلیمات کی اشاعت کے لئے کافی مثبت کوشش ہوئی۔ مگر اس سلسلہ میں جہاں ہم نے اچھے اقدامات اٹھائے وہاں کچھ بنیادی سہو و خطا بھی سرزد ہوئے ان خطاؤں کا ایک مجموعی نتیجہ یہ مرتّب ہوا کہ قرآنی تعلیمات کے مروّجہ طریق روزمرّہ زندگی میں اسلامی انقلاب لانے میں ہماری توقّعات پر پورا اُترنے میں ناکام رہے۔ چنانچہ قرآن و سنّت کے ظاہری غلغلہ کے باوجود ہماری معیشت و معاشرت نجاست و ہلاکت کی دلدلوں میں دھنستی چلی گئی۔

ہر چند کہ آج ہمارے ماحول میں قرآنِ حکیم کا اثر و رسوخ بظاہر نمایاں نظر آتا ہے، اصل صورتِ حال اس قدر مخدوش ہے کہ بے اختیار رونے کو جی چاہتا ہے۔ اگر کسی بے بصر کو اس مشاہدے سے اب بھی اختلاف ہو تو ہوتا رہے، حقیقت بہرکیف وہی ہے جو سب کے سامنے ہے۔

درسِ قرآن کی مروّجہ مجالس | "درسِ قرآن اور تعمیرِ حیات!" کے حوالے سے آپ سے مخاطب ہونے سے میری مراد یہ ہے کہ ہمارے مروّجہ تدریسِ قرآن کا سرسری جائزہ لیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ ہمارا مستعمل طریق ملک و ملّت کی تعمیر و ترقی میں کس حد تک کامیاب یا ناکام رہا ہے۔

درسِ قرآن کی مروّجہ مجالس کو تین اقسام میں بانٹا جا سکتا ہے :

اوّل: مدرسوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں طلبہ کے لئے درسِ قرآنِ حکیم۔

دوم : مساجد اور اہم ملّی مراکز میں عامۃ الناس کے لئے درسِ قرآنِ عزیز۔

سوم : ٹیلیویژن، ریڈیو اور دیگر ذرائع ابلاغ کے ذریعہ ہر قسم کے سامعین اور ناظرین کے لئے درسِ قرآن مجید۔

درسِ قرآن کے ان تمام اہتمامات کے بنیادی محاسن یہ ہیں کہ مدرّس عموماً پڑھے لکھے افراد ہوتے ہیں۔ ان میں سے اکثر کے اندازِ خطاب خاصے مؤثر ہوتے ہیں۔ سامعین میں بھی کافی دلچسپی اور حرارت کا رنگ نظر آتا ہے۔ مگر اس کے باوجود نہ جانے کیا بات ہے کہ تعمیرِ ملّی سے متعلق متوقع اثرات تاہنوز مرتب ہونا شروع نہیں ہوئے۔ چند تعلیمی اداروں میں درسِ قرآن کے وسیلہ سے حالات میں بہتری کی خال خال اطلاعات موصول ہوئی ہیں۔ مگر مجموعی طور پر صورتِ حال میں سیرتِ کردار کا پرنالہ وہیں کا وہیں ہے۔ بلکہ کئی صورتوں میں حالات مزید زبوں انحطاط نظر آتے ہیں۔

ناکامی کے چند اہم اسباب | ظاہر ہے کہ یہ امر ہم سب کے لئے باعثِ تشویش ہے کہ آخر اشاعتِ تعلیماتِ قرآن کے اس غیر معمولی ولولہ کے بعد بھی ہمارے انفرادی اور اجتماعی سیرت و کردار میں صحت و سلیقہ کا افسوسناک فقدان کیوں ہے؟ میرے تجزیہ کے مطابق روزمرّہ معیشت و معاشرت میں متوقع تبدیلی لانے میں مروّجہ درسِ قرآن کی ناکامی کے چند بڑے اسباب یہ ہیں :

(۱) پیشکش کے غیر سائنٹیفک، بورکن، طوالت پسند اور تکراری انداز۔

(۲) درسِ قرآن میں اوّل تا آخر منطق و معقولیت کی بجائے جذباتیت، اور کئی حالتوں میں گپ اور ریکیڑ کا غلبہ۔

(۳) احکامِ قرآنی کو مسائلِ حیات سے مربوط کرنے کی کوششوں کا افسوسناک فقدان اور زندگی سے کٹی ہوئی تشریحات پر بے تحاشا زور۔
(۴) تعلیماتِ قرآنی کا عملی، اصلاحی یا ترقیاتی منصوبوں سے عدم ربط۔
(۵) تاثیر اور عدم تاثیر یا غلط تاثیر کے تخمینہ کے لئے کسی قسم کے موثق و معروضی طریق کار کا عدمِ استعمال وغیرہ وغیرہ۔

ترمیم و اصلاح کے لئے چند تجاویز درسِ قرآن کے مروجہ طریقوں میں ان اور اسی قسم کی بیسیوں اور فروگذاشتوں کی وجہ سے قرآنی تعلیمات کا اصل مقصد تقریباً فوت ہو چکا ہے۔ اور یہ بدنصیب معاشرہ اس وجہ سے بھی صحت و سلامتی کی منزل سے بھٹکتا چلا جا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ صورتِ حال میں ترمیم و اصلاح ناگزیر ہے۔ غور و فکر کے لئے چند تجاویز پیش ہیں:

(۱) درسِ قرآن کے متن و معانی کو سلیس، مدلل اور مختصر انداز میں پیش کیا جانا چاہیئے۔
(۲) درسِ قرآن کے لئے مدرّس جو موضوع بھی منتخب کرے اسے روزمرّہ زندگی اور اس کے بنیادی تقاضوں سے مربوط کر کے پیش کرنا از حد ضروری ہے۔
(۳) درسِ قرآن سے پہلے، دوران یا بعد منتخب آیات سے متعلق کسی نہ کسی چھوٹے بڑے عملی، اصلاحی یا ترقیاتی منصوبے یا کسی پہلے ہی سے جاری و ساری کارِ خیر میں سامعین درس کے لئے ذاتی مشارکت اور عملی تعاون کی تحریک بھی اشد ضروری ہے۔
(۴) کیا درسِ قرآن سامعین کے فکر و عمل کے دھارے موڑنے کا باعث بنتا ہے یا نہیں؟ ـــــ اس بات کا پتہ لگانے کے لئے تاثیر یا عدم تاثیر کے موثق طریق کار مثلاً احتساب، امتحان، تجزیہ وغیرہ کا باضابطہ استعمال ناگزیر ہے ـــ!!
(۵) قرآن عزیز کی نشر و اشاعت کرنے والے تمام افراد اور اداروں کی ایسی جامع اور منظم تربیت کا اہتمام بھی ضروری ہے جس سے انہیں جدید مسائل اور ان کے حل کے عملی اصولوں اور افہام و تفہیم کے سائینسی طریقوں سے

رُوشناس کرایا جائے۔

(۶) قرآنِ حکیم اور روزمرہ زندگی میں کھویا ہوا ربط بحال کرنے کے لئے جامع اور ٹھوس تحقیقوں کا فوری اہتمام کیا جائے۔

تعیشِ سماعی یا تعمیر حیات ان تمام تجاویز کا مدعا یہ ہے کہ درسِ قرآن کو اصلاح و تعمیرِ ملی کی ایک فعال تحریک کی صورت دینے کے سامان فراہم کئے جائیں تاکہ قرآنِ حکیم میں وضع شدہ احکامات کی روشنی میں ملی اور عالمی معیشت و معاشرت میں غلبۂ اسلام کی کوئی قابلِ عمل راہ ہموار کی جا سکے۔ ان مختصر گذارشات میں کہنا میں فقط یہ چاہتا ہوں کہ پسند آپ کی ہے چاہے آپ درسِ قرآن کو ایک پُرکیف رسمی، روحانی محفل بنائے رکھیں یا اسے معیشت و معاشرت میں تعمیر اور تخلیق کا مؤثر وسیلہ بنا دیں۔ بہرکیف درسِ قرآن کو تعیشِ سماعی کا ذریعہ بنائے رکھنا، باہمی تنافرت کے فروغ کے حربہ کے طور پر استعمال کرنا یا سُریلی صداؤں کے ایک ایسے غیر مربوط مجموعہ تک محدود کئے رکھنا جسے عقل و عمل سے کوئی واسطہ ہی نہ ہو، انتہائی غیر معقول حرکت ہے۔

محفلِ درسِ قرآن کو ترتیب دینے کا واحد طریق یہی ہے کہ پوری تخلیقی صلاحیت سے کام لے کر اس کی تنظیم یوں ہو کہ اس کی وساطت سے ذہن اور جسم میں تحریک عمل پیدا ہو، سیرت و کردار میں جلا آ سکے، افرادِ خاندان اور معاشرہ اس کی روشنی میں ہر قسم کی تاریکی، جہالت، نفاق اور تنزل سے نجات پاتے دکھائی دیں اور فلاحی سمتوں کی جانب جادہ پیما ہوتے نظر آئیں۔ درسِ قرآن کے بعد اگر اس قسم کے مطلوبہ نتائج برآمد ہونے کی کوئی صورت نظر نہ آتی ہو تو پھر فاضل مدرس، اور حساس سامع دونوں کے لئے یہ سوچنا لازم ہو جاتا ہے کہ ہم سب کہیں شعوری یا لاشعوری طور پر نعمتِ قرآن سے کفران اور صراطِ مستقیم سے بھٹکنے کے مرتکب تو نہیں ہو رہے ہے؟

(بقیہ صے ۸۴)

معراجِ زندگی نہیں۔ 'علم را بر تن زنی' کی منزل پر رکے رہنا اپنی قومی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا نہیں۔ علم کا اطلاقی پہلو بھی ہے۔ ہمیں اپنے آپ سے یہ سوال پوچھنا چاہیئے کہ ہم نوجوان نسل کے لئے اپنے مذہبی تصورات کو کیسی منطقی اور فلسفیانہ بنیادیں

عظمتِ قرآن بزبانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

سیّد حامد میاں

اس موضوع پر مضامین لکھے جاتے رہے ہیں، میں چاہتا ہوں کہ حسبِ توفیق چند احادیث جمع کردوں جن سے قرآنِ کریم کی عظمت ظاہر ہوتی ہے۔

عن عطیة قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم ما من کلام اعظم عند اللّٰہ من کلامه وما رد العباد الی اللّٰہ کلامًا احب الیه من کلامه۔

الدارمی : ۷۰۴

(قلت - الحدیث مرسل)

حضرت عطیہ بن قیسؒ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کے کلامِ پاک سے بڑھ کر باعظمت کوئی کلام نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ کے حضور بندوں کی طرف سے کوئی کلام اس کے کلام سے زیادہ محبوب و پسندیدہ نہیں پیش کیا جا سکتا۔

یہ روایت سُنن دارمی کی ہے جو حدیث کی معتبر کتاب ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے دارمی رحمۃ اللہ علیہ کا تعارف کرا دیا جائے کیونکہ اس مضمون میں صرف ان کی اسی کتاب کی روایات دی گئی ہیں۔ امام دارمی عبداللہ بن عبدالرحمٰن سمرقندی دارمی امام بخاریؒ سے تیرہ سال بڑے تھے، اس لئے ان کی ثلاثیات کی تعداد امام بخاریؒ کی ثلاثیات سے زیادہ ہے۔ امام بخاری، امام مسلم، ابوداؤد، ترمذی اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہم کے صاحبزادے عبداللہ ان کے شاگرد ہیں۔ ان کی وفات ۲۵۵ ھجری

میں امام بخاریؒ کی وفات سے ایک سال قبل ہوئی، مرو میں مدفون ہیں (جو آج کل روس میں ہے)۔ امام بخاریؒ کو جب ان کی وفات کی خبر پہنچی تو سر جھکا لیا۔ پھر سر اٹھا کر انا للہ پڑھی۔ ان کے آنسو رخساروں پر بہہ آئے اور یہ شعر پڑھا ؎

فان تبق تفجع بالاحبة کلھم　　وفناء نفسک لا ابا لک افجع

(اگر تم زندہ رہے تو سارے دوستوں کے غم فراق کا دکھ اٹھاؤ گے اور خود اپنی فناء زیادہ پریشان کن اور تکلیف دہ چیز ہے!)

امام بخاری رح کی عادت نہ تھی کہ وہ شعر پڑھیں۔ صرف وہ اشعار جو حدیثوں میں آتے ہیں، پڑھتے تھے۔ سنن دارمی کو بہت سے علماء نے صحاح ستہ میں چھٹا درجہ دیا ہے۔

(۲) عن زید بن ارقمؓ قال قام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یومًا فخطبنا فحمد اللہ واثنیٰ علیہ ثم قال یا ایھا الناس انما انا بشر یوشک ان یاتینی رسول ربی فاجیب و انی تارک فیکم الثقلین اولھما کتاب اللہ فیہ الھدیٰ والنور فتمسکوا بکتاب اللہ وخذوا بہ فحث علیہ ورغب فیہ ثم قال واھل بیتی اذکرکم اللہ فی اھل بیتی ثلاث مرات۔ سنن الدارمی ۲ ج ۴۳۲

(قلتُ رواہ موسلاً)

حضرت زید بن ارقم رض نے فرمایا کہ ایک دن جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ ارشاد فرمانے کے لئے کھڑے ہوئے۔ حمد و ثنا کے بعد آپ نے فرمایا کہ اے لوگو! میں انسان ہوں۔ قریب ہے کہ میرے پاس میرے پروردگار کا فرستادہ آئے تو میں اس کے بلانے پر اس کے پاس چلا جاؤں اور میں تم میں دو بھاری چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ ان میں پہلی چیز کتاب اللہ ہے اس میں ہدایت اور نور ہے۔ کتاب اللہ کو مضبوطی سے پکڑے رہو اور اس سے (اصول و مسائل) لیتے رہو۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابھارا اور ترغیب دی، پھر ارشاد فرمایا اور میرے اہل بیت میں تم کو اہل بیت کے بارے میں خدائے تعالیٰ کی یاد دلاتا ہوں تین بار ارشاد فرمایا۔

(۳) عن شھر بن حوشب قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فضل

حضرت شہر بن حوشب رح فرماتے ہیں کہ جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا

كلام الله على خلقه كفضل الله على خلقه - الدارمی ص ۴۷۱

(قلتُ رواه موسلاً)

کہ اللہ تعالیٰ کے کلام کی برتری اپنی مخلوق پر ویسی ہے جیسے اللہ تعالیٰ کی برتری اپنی مخلوق پر ہے۔

(۴) عن عبد الله بن عمرو عن رسول الله صلّى الله عليه وسلّم انه قال القرآن احب الى الله من السّمٰوٰت والارض ومن فيهن

(الدارمی ص ۴۷۱)

حضرت عبد اللہ بن عمرو جناب رسول کریم علیہ الصّلوٰۃ والتّسلیم سے نقل فرماتے ہیں کہ آپ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ کو قرآن پاک آسمانوں اور زمین اور جو اُن میں رہتے ہیں ان سب سے زیادہ محبوب ہے۔

(۵) عامر بن واثلة ان نافع بن عبد الحارث لقي عمر بن الخطّاب بعسفان وكان عمر استعمله على اهل مكة فسلّم على عمر فقال له عمر من استخلفت على اهل الوادی فقال نافع استخلفت عليهم ابن ابزٰی فقال مولًى من موالينا فقال عمر فاستخلفت عليهم مولًى - فقال يا امير المومنين انهٗ لقارئٌ لكتاب الله عالم بالفرائض - فقال عمر : اما ان رسول الله صلّى الله عليه وسلّم قد قال ان الله يرفع بهذا الكتاب اقوامًا ويضع به الآخرين ٥

(الدارمی ص ۷۷۳)

عامر بن واثلہ نقل کرتے ہیں کہ حضرت نافع ابن عبد الحارث رضؓ، حضرت سیّدنا عمر فاروق رضؓ سے عسفان میں ملے۔ حضرت عمر رضؓ نے نافع رضؓ کو مکّہ مکرّمہ کا والی بنا رکھا تھا (انہیں عسفان میں دیکھ کر) دریافت فرمایا کہ اہل وادی (مکّہ) پر کسے اپنا نائب مقرّر کر کے آئے ہو؟ نافع رضؓ نے کہا کہ ابن ابزیٰ کو حضرت نے دریافت فرمایا، اور یہ ابن ابزیٰ کون ہے؟ کہا ہمارے آزاد کردہ غلاموں میں سے ایک ہیں۔ فرمایا تو کیا تم نے اپنے ایک آزاد کردہ غلام کو اپنا قائم مقام مقرّر کیا ہے؟ وہ عرض کرنے لگے: اے امیر المومنین وہ کتاب اللہ کے قاری (عالم) ہیں (اور) فرائض جانتے ہیں۔ اس پر حضرت عمر رضؓ نے فرمایا کہ واقعی جناب رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب سے بہت سے لوگوں کو سربلندی نصیب فرمائے گا اور دوسروں کو زوال دے گا۔

(۶) عن الحارث عن علیؓ قال قیل یا رسول اللہ ان امتک ستفتتن من بعدک قال فسأل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اوسئل ما المخرج منھا قال الکتاب العزیز الذی لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ تنزیل من حکیم حمید من ابتغی الھدی فی غیرہ فقد اضلہ اللہ ومن ولی ھذا الامر من جبار فحکم بغیرہ قصمہ اللہ ھو الذکر الحکیم والنور المبین والصراط المستقیم فیہ خبر من قبلکم و نبأ ما بعدکم وحکم ما بینکم وھو الفصل لیس بالھزل وھو الذی سمعتہ الجن فلم تنتاھوا ان قالوا انا سمعنا قرآنا عجبا یھدی الی الرشد ولا یخلق عن کثرۃ الرد ولا تنقضی عبرہ ولا تفنی عجائبہ ثم قال علی للحارث خذھا الیک یا اعور۔ (سنن الدارمی ۳۶ ج ۲)

حارث حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت کرتے ہیں، انہوں نے فرمایا، جناب سالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا گیا کہ جناب کے بعد جناب کی امت فتنہ میں مبتلا ہو جائے گی۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا یا آپ سے دریافت کیا گیا کہ فتنوں سے بچ نکلنے کی سبیل کیا ہوگی۔ ارشاد فرمایا کہ کتاب عزیز جس کے سامنے یا پس پشت سے باطل نہیں آئے گا۔ اللہ پاک کی طرف سے نازل کردہ ہے جو حکیم و حمید ہے جو کتاب اللہ کے احکام کو چھوڑ کر کہیں اور سے ہدایت کا طالب ہوگا تو سمجھ کر یقیناً ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ نے گمراہی پر چلتا چھوڑ دیا ہے، اور جو جبار حکمران حکومت پر آجائے اور قرآن پاک کے احکام کو چھوڑ کر دوسرے احکام سے حکومت چلائے تو اللہ تعالیٰ اسے ہلاک و برباد کر دے گا۔ یہ قرآن پاک ذکر حکیم ہے (حکمت والا کلام الٰہی ہے) اور واضح کر دینے والا نور ہے۔ یہی (اس پر عمل کرنا) سیدھا راستہ ہے۔ اس میں تم سے پہلے لوگوں کے حالات ہیں اور تمہارے بعد کے دور کی خبریں ہیں اور تمہارے آپس میں کرنے کے فیصلے ہیں۔ وہ کچا فیصلہ کن کلام ہے، مذاق نہیں۔ یہی وہ کلام ہے کہ جسے جب جنات نے سنا تو یہ کہے بغیر نہ رہ سکے کہ ہم نے عجیب کلام پاک سنا ہے جو بھلائی کا راستہ دکھاتا ہے اور یہ کلام بار بار پڑھنے سے بھی پرانا نہیں لگتا۔ اس کے پڑھنے سے جو سبق حاصل ہوتے رہتے ہیں وہ کبھی ختم نہیں ہوتے اور اس کے عجائبات لافانی ہیں۔ پھر حضرت علیؓ نے حارث سے فرمایا، اے اعور یہ حدیث لے (اسے

یاد رکھو)

مفسّرین قرآن کیلئے سیّدنا فاروق اعظمؓ کا بتلایا ہوا زرّیں اصول

قال عمر بن الخطاب ان ھذا القرآن کلام اللہ فلا یغرنکم ما عطفتموہ علیٰ اھوائکم (الدارمی ص ۷۴ ع)	سیّدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا کہ یہ قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے تو اسے اپنی خواہش کے مطابق موڑ کر مطلب نکال کر لینے کو دھوکہ میں نہ ڈالنا۔

اہل باطل قرآنِ پاک کی تفسیر اپنی رائے سے کرتے ہیں۔ اس سے سب بچیں۔ تفسیر احادیث کی روشنی میں ہوا کرتی ہے۔ مفسّرین کرام نے اصول بھی مقرر فرما دیئے ہیں ان کی پابندی ضروری ہے۔

قرآن پاک پڑھنے اور قراءت سیکھنے اور سکھانے کی فضیلت کے لئے احادیث ملاحظہ فرمائیں

(۷) عن علیؓ قال قال رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم خیرکم من تعلّم القرآن وعلّمہٗ (الدارمی ص ۳۷ ع ج ۲)	حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے فرمایا کہ جناب رسالتمآب صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا کہ تم میں بہترین لوگ وہ ہیں جو قرآن پاک سیکھیں اور سکھائیں۔
(۸) عن سعد بن عبیدۃ عن ابی عبد الرحمٰن السلمی عن عثمانؓ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلّم قال ان خیرکم من علّم القرآن وتعلّمہٗ قال اقرءَ القرآن ابو عبد الرحمٰن فی اِمرۃ عثمان حتی کان الحجاج قال ذالک اقعدنی مقعدی ھٰذا (الدارمی ص ۳۷ ع ج ۲)	حضرت سعد بن عبیدہ، حضرت ابو عبد الرحمٰن السلمی سے اور وہ حضرت سیدنا عثمان غنی رضؓ سے اور وہ جناب سرورِ کائنات علیہ الصّلوۃ والسّلام سے نقل فرماتے ہیں کہ آپ نے ارشاد فرمایا: ”بلاشبہ تم میں بہتر وہ لوگ ہیں جو قرآن پاک کی تعلیم دیں اور اس کی تعلیم حاصل کریں!“— سعد بن عبیدہ فرماتے ہیں کہ ابو عبد الرحمٰنؒ نے حضرت عثمان غنی رضؓ کے دورِ امارت

میں پڑھانا شروع کیا حتّٰی کہ حجّاج کا زمانہ آیا۔ فرماتے تھے کہ اسی (فضیلت) نے

مجھے یہاں بٹھا رکھا ہے!"

نوٹ: اس حدیث میں حضرت ابوعبدالرحمٰن سُلَمی کا اسم گرامی آیا ہے۔ یہ نہایت عظیم المرتبت عالم تھے۔ مقدمہ نصب الرایہ میں ان کے بارے میں تحریر ہے:

ابوعبدالرحمٰن عبداللہ بن حبیب السلمیؓ المتوفی ۷۴ھ نے حضرت علی کرّم اللہ وجہہٗ کو قرآن پاک سنایا۔ قراءت میں حضرت علیؓ کے یہ بہترین شاگرد ہیں۔ انہوں نے اپنے آپ کو صرف قرآن پاک کی تعلیم کے لئے وقف کر دیا تھا اور کوفہ کی مسجد میں چالیس سال پڑھاتے رہے۔ حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ نے اپنے والد ماجد کے حکم سے ان سے قراءت اخذ کی اور امام عاصمؒ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قراءت ابوعبدالرحمٰن سے اخذ کی یہی وہ قراءت ہے جو امام حفص نے امام عاصم سے روایت کی ہے اور قراءۃ عاصم دونوں طریقوں سے تمام طریقوں میں تواتر کے سبب سے اعلیٰ درجہ کی ہے۔ ابوعبدالرحمٰن السلمی نے سیدنا عثمان غنی اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہما کو بھی قرآن پاک سنایا تھا!"۔

(مقدمہ نصب الرایہ ص ۳۱)

(۹) عاصم بن بهدلة عن مصعب بن سعدؓ عن ابیه قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم خیارکم من تعلم القرآن وعلم القرآن قال فاخذ بیدی واقعدنی هٰذا المقعد اُقرئُ

(الدارمی ص ۴۳۷ ج ۲)

حضرت عاصم بن بہدلہ حضرت مصعب سے اور وہ اپنے والد حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ سے نقل کرتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم میں بہترین لوگ وہ ہیں جو قرآن پاک کا علم حاصل کریں اور قرآن پاک سکھائیں عاصم بن بہدلہ فرماتے ہیں کہ حضرت مصعب نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے اس جگہ بٹھا دیا کہ پڑھاؤں۔

نوٹ: امام عاصمؒ قراء کوفہ میں مشہور قاری ہیں، انہوں نے زِرّ بن حُبَیش اور ابوعبدالرحمٰن السلمی سے علم قراءت حاصل کیا تھا۔

(تہذیب التہذیب ص ۳۸ ج ۵)

کسی مسلمان کو ایسا نہ ہونا چاہیئے کہ اسے قرآن پاک کچھ بھی نہ آتا ہو۔ اس حدیث پاک کو دیکھئے :

(۱۰) عن ابن عباسؓ قال قال رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم ان الرجل الذی لیس فی جوفہ شئ من القرآن کالبیت الخرب
(سنن دارمی ۲۹ ع ج ۲)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا: "وہ آدمی جس کے اندر قرآن پاک میں سے کچھ بھی نہ ہو وہ ویران گھر کی طرح ہے !"

(۱۱) عن ابی سعید الخدری قال قال رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم من شغلہ قراءۃ القرآن عن مسألتی و ذکری اعطیتہ افضل ثواب السائلین وفضل کلام اللہ علی سائر خلقہ کفضل اللہ علی خلقہ۔ (الدارمی ص ۱ ع ع)

حضرت ابوسعید خدری رضؓ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا کہ جناب رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا: "جسے قرآن پاک کی تلاوت نے اتنا مشغول کر دیا ہو کہ وہ مجھ سے مانگے (مانگنے کا وقت بھی اس کے پاس نہ رہا ہو) اور (دوسرے کلمات اور دعاؤں سے) میرے ذکر کا وقت بھی (اس کے پاس نہ بچتا ہو) تو میں اسے مانگنے والوں سے (زیادہ اور) افضل ثواب دوں گا۔ اور اللہ تعالیٰ کے کلام کی برتری اس کی پوری مخلوق پر ایسی ہے جیسے ذاتِ حق تعالیٰ کی برتری اپنی مخلوق پر۔

(۱۲) عن انسؓ قال قال رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم اِنَّ لِلّٰہِ اَھلِیْنَ مِنَ الناس قیل من ھم یا رسول اللہ قال اھل القرآن۔
(سنن الدارمی ۳۳ ع)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا کہ: لوگوں میں اہل اللہ ہیں۔ دریافت کیا گیا اے اللہ کے سچے رسول وہ لوگ کون ہیں۔ ارشاد فرمایا قرآن پاک والے !

بچّوں کے قرآن پاک کے پڑھنے اور سیکھنے کی فضیلت جو صحابۂ کرام میں معروف

تھی۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی ذکر کر دی جائے: ثابت بن عجلان بیان فرماتے ہیں کہ:

ثابت بن عجلان الانصاری قال کان یقال ان اللہ لیرید العذاب باھل الارض فاذا یسمع تعلیم الصبیان الحکمۃ صرف ذالک عنھم۔ قال مروان بن محمد یعنی بالحکمۃ القرآن۔

(الدارمی ص ۳۹ ج)

حضرت ثابت بن عجلان انصاریؒ نے بتلایا کہ یہ کہا جاتا تھا کہ حق تعالیٰ اہل زمین کو عذاب میں مبتلا کرنے کا ارادہ فرماتے ہیں، لیکن جب بچوں کے قرآن پاک پڑھنے کی طرف اس کی صفت سمع متوجہ ہوتی ہے تو اس عذاب کو ان سے ٹال دیتا ہے۔

نوٹ: ثابت بن عجلان انصاری حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت ابوامامہؓ کے شاگرد ہیں (تہذیب التہذیب ص ۱۰ ج ۲)

● صحابہ کرامؓ قرآنِ پاک کا اکرام کس طرح کرتے تھے ملاحظہ ہو!

عن ابن ابی ملیکۃ ان عکرمۃ بن ابی جہل کان یضع المصحف علی وجھہ ویقول کتاب ربی کتاب ربی۔

(الدارمی ج ۲)

ابن ابی ملیکہ فرماتے ہیں کہ ابوجہل کے بیٹے حضرت عکرمہؓ قرآن پاک کو اپنے چہرہ پر رکھ لیا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ یہ میرے پروردگار کی کتاب ہے، یہ میرے ربّ کی کتاب ہے۔

قرآن پاک دیکھ کر پڑھنا بہت سے اسلاف سے منقول ہے بعض حضرات صبح شام دیکھ کر پڑھتے تھے اور بعض کسی اور وقت مثلاً ابن ابی لیلیٰ صبح کو پڑھتے تھے۔

ثابت قال قال عبد الرحمن بن ابی لیلی کان اذا صلی الصبح یقرأ المصحف حتی تطلع الشمس قال وکان ثابت یفعلہ۔

(الدارمی ص ج ۲)

حضرت ثابتؒ فرماتے ہیں کہ عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰؒ جب صبح کی نماز سے فارغ ہوتے تھے تو طلوع آفتاب تک مصحف (دیکھ کر) تلاوت کرتے تھے اور حضرت ثابتؒ بھی اسی طرح کرتے تھے۔

نوٹ: حضرت عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ نے ایک سو بیس صحابہ کرام کو پایا ہے اور قاضی

بھی رہے ہیں۔ ابن اشعثؒ کے ساتھ ۸۳ھ میں بحری جنگ میں شہید ہوئے۔
(مقدمہ نصب الرایہ ۳۲)

● معاذ اللہ! کوئی شخص قرآنِ پاک یاد کرکے بھلا دے تو یہ بہت بڑا گناہ اور محرومی ہے

(۱۳) عن عبد اللہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال بئسما لاحدکم ان یقول نسیت آیۃ من کیت و کیت بل ھو نسّی واستذکروا القرآن فانہ اسرع تفصّیاً من صدور الرجال من النعم من عقالھا۔ (الدارمی ۳۹ ج)

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضؓ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں کہ آپ نے ارشاد فرمایا: "بہت بُری بات ہے کہ تم میں سے کوئی یہ کہے کہ میں کوئی آیت فلاں فلاں مقام سے بھول گیا ہوں (یہ نہیں ہوتا) بلکہ اسے یہ بھلا دی گئی۔ اور قرآن پاک کو یاد کرتے ہی رہو کیونکہ وہ لوگوں کے سینوں میں سے اس سے بھی زیادہ جلدی چلا جاتا ہے، جیسے جانور باندھنے کی جگہ سے اگر اسے نہ باندھا جائے تو نکل جاتا ہے!

(۱۴) عن عقبۃ بن عامر عن ابیہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال تعلموا کتاب اللہ و تعاھدوہ و افشوہ وتغنوا بہ فوالذی نفسی بیدہ لھو اشد تفلتا من المخاض فی العقل۔ (الدارمی ص ۳۹ ج)

حضرت عقبہ بن عامر رضؓ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کتاب اللہ سیکھو، اس کا خیال رکھو، اُسے (یادداشت میں) جمع رکھو اور اسے خوش الحانی سے پڑھو قسم اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، وہ اس سے بھی زیادہ تیزی سے نکل جاتا جیسے چھٹنے والا تیار جانور اپنی رسّیوں سے۔

نوٹ: حدیث شریف میں تَغَنَّوْا بِہٖ کا لفظ آیا ہے اس کی دو تفسیریں کی گئی ہیں ایک تو یہ کہ خوش الحانی سے پڑھو۔ دوسری یہ کہ قرآنِ پاک کی وجہ سے مخلوق سے بے نیاز رہو ——!!

جو شخص قرآن پاک یاد کر کے بھلا دے اس کے لئے شدید وعید آئی ہے۔ والعیاذ باللہ۔

(۱۵) عن سعد بن عبادة ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ما من رجل یتعلم القرآن ثم ینساہ الا لقی اللہ یوم القیامة وھو اجذم۔

(الدارمی ص ۳۷ ج ۲)

حضرت سعد بن عبادہؓ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو آدمی بھی قرآن پاک سیکھتا ہے پھر بھول جاتا ہے وہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سے جذام کی حالت میں ملے گا۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی نافرمانی اور معصیت سے بچائیے، توفیقِ مرضیات اور اسلام پر استقامت بخشے، اپنی رضائے کاملہ نصیب فرمائے۔ آمین! دل تو چاہتا تھا کہ چالیس احادیث ہو جاتیں، اسی لئے اس مضمون میں صرف احادیث، ان کے عنوانات اور ترجمہ پر اکتفا کیا تھا۔ لیکن مضمون بہت طویل ہو جاتا، خدا کرے کسی وقت یہ ارادہ پورا ہو جائے۔

۲۵ رجمادی الاولیٰ ۱۴۰۰ھ
۱۳ را پریل ۱۹۸۰ء

حامد میاں عفی عنہ
جامعہ مدنیہ۔ کریم پارک۔ راوی روڈ۔ لاہور

(بقیہ ص ۸۷)

ایک سچے امتی کی طرح اس وعدہ کا بھی ایفاء کریں گے جو حجۃ الوداع میں جبلِ رحمت پر کھڑے ہو کر میدانِ عرفات میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت سے لیا تھا کہ: "گواہ رہنا! میں نے تم تک خدا کا دین پوری طرح پہنچا دیا اور اب تمہیں ان لوگوں تک پہنچانا ہے جو کہ یہاں موجود نہیں ہیں!"

۱۵-۴-۸۰ء

عہدِ حاضر میں
سُنّتِ رسولؐ کی اہمیّت

ڈاکٹر الطاف جاوید

اس عہد میں جب کہ ایک طرف اسلامی نشاۃِ ثانیہ کی ضرورت اور شدید احساس کی حرارت تمام مسلم اقوام کے قلوب کو گرما رہی ہے اور ایک عظیم تحریک تدریج بڑھتی اور پھیلتی چلی جا رہی ہے اور دوسری طرف پاکستان میں نظامِ مصطفےٰ کے نفاذ کی پرزور تیاریاں ہو رہی ہیں۔ ایسے مناسب ماحول میں سنّت نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے تمام پہلوؤں کا مطالعہ نہ صرف مفید رہے گا بلکہ یہ وقت کی اہم ضرورت بھی ہے۔

سُنّت کی اصطلاح اسلامی ادب میں اگرچہ صحابہ کرام کے افعال و اقوال اور ائمۂ قانون کے لئے بھی استعمال کی جاتی ہے، مگر یہاں اس اصطلاح کا دائرہ صرف رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے افعال و اقوال تک محدود ہے۔

سنّت کا مفہوم اور تعریف | جیسا کہ برِّ صغیر کے ممتاز عالمِ دین مولانا محمّد تقی امینی صاحب نے اپنی کتاب: "فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر" میں ہمیں بتایا ہے کہ: "سُنّت کے لغوی معنیٰ مروّجہ طور طریقہ کے ہیں لیکن فقہا کی اصطلاح میں سُنّت سے مراد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے تمام اقوال و افعال، اور دوسروں کے وہ اقوال و افعال مراد ہیں جن سے آپ نے سکوت فرمایا اور جن کو قائم و برقرار رکھا"۔ صحابہ کرامؓ کے اقوال و افعال بھی اس بنیاد پر سنّت میں داخل ہیں کہ اُن کے پاس رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی قولی یا فعلی سند موجود ہو گی۔ "نور الانوار" میں تصریح کی گئی ہے کہ: "سُنّت کا اطلاق رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے قول و فعل پر، آپ کے سکوت اور صحابہؓ کے اقوال و افعال پر ہوتا ہے"۔ البتہ حدیث کا محل خاص ہے کہ اس کا اطلاق فقہا کے نزدیک صرف رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے اقوال پر ہوتا ہے۔ زیرِ مطالعہ مضمون بحث

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل اور سکوت سے ہے، خواہ ان کا نام سنت رکھا جائے یا انہیں حدیث کہا جائے ــــ!!

اصطلاح سنت کی مزید تشریح کرتے ہوئے مولانا موصوف فرماتے ہیں کہ:

"دراصل قرآنِ حکیم نقشۂ تعمیر ہے اور سنتِ رسول اس نقشہ کے مطابق تیار کی ہوئی عمارت ہے۔ نقشہ یعنی کتاب کے ساتھ انجینئر یعنی رسول کے بھیجنے کے اصول پر اس وقت سے برابر عمل ہو رہا ہے جب سے ہدایتِ الٰہی کے سلسلہ کی ابتدا ہوئی ہے!"

اس عہد میں سنت کے مطالعہ کی اور بھی اہمیت بڑھ جاتی ہے جب کہ ہمارے ملک میں قرآن حکیم اور اسلامی ادب کے مفسر اور شارح موجود ہیں، جنھوں نے مملکتِ پاکستان کے دستور میں قرآن کے ساتھ لفظِ سنت کی موجودگی پر شدید احتجاج کیا ہے اور مطالبہ کیا ہے کہ دستور کی اس شق سے جس میں یہ صراحت کی گئی ہے کہ: "مملکت کا کوئی قانون کتاب و سنت کے خلاف نہیں ہوگا!" لفظِ سنت کو خارج کر دیا جائے اور محض کتاب کا لفظ رہنے دیا جائے۔ اس لئے ضروری ہے کہ سنت کی بنیاد کو قرآنِ حکیم، صحابہ کے طرزِ عمل اور ائمۂ قانون کی تصریحات میں تلاش کیا جائے۔ چنانچہ مولانا محمد تقی امینی صاحب مدظلہ کی مذکور کتاب اس مسئلہ پر مزید روشنی ڈالتی ہے۔

قرآن میں سنت کی بنیاد

سورۂ نحل کی آیت ۴۴ میں ہے کہ:

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۝ "اور ہم نے آپ پر الذکر (قرآن) نازل کیا ہے تاکہ جو تعلیم لوگوں کی طرف بھیجی گئی ہے وہ ان پر واضح کر دیں اور تاکہ وہ لوگ غور کریں!"۔ اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن حکیم کا شارح قرار دیا گیا ہے۔ سورۃ النساء کی آیت ۱۰۵ میں تصریح ہے کہ: اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ

(اے پیغمبرؐ! ہم نے آپ پر "الکتاب" سچائی کے ساتھ نازل کر دی ہے تاکہ جیسا کچھ اللہ تعالیٰ نے بتلا دیا ہے آپ اس کے مطابق فیصلہ کریں۔) پھر المائدہ کی ۶۷ ویں آیت میں ہے کہ: يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ

اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ ط (اے رسولؐ! جو کچھ آپ پر آپ کے ربّ کی طرف سے نازل کیا گیا ہے آپ اس کی تبلیغ کریں!) — اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو اپنا مبلّغ بنایا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ شرح و تبلیغ اور فیصلہ کی صورت یہ تھی کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم اپنے قول یا فعل سے یا دونوں سے یا مروّجہ طریقوں پر سکوت فرما کر انہیں رکھنے کے لئے قرآنِ حکیم کے مطالب و مقاصد کی وضاحت فرماتے تھے۔ اس بنا پر سُنّت کے نام سے کوئی شے ایسی نہ ہونی چاہیئے جس کے معانی و مقاصد کی دلالت اصولی طور پر قرآنِ حکیم میں موجود نہ ہو۔ علّامہ شاطبی فرماتے ہیں کہ: "لیس فی السنّۃ الا و اصلہ فی القرآن" (حدیث میں کوئی بیان ایسا نہیں کہ جس کی اصل قرآنِ حکیم میں نہ ہو!) — اسی طرح قرآنِ حکیم کی ایسی تعبیر و توجیہ درست نہ ہوگی جو رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی بیان کردہ توجیہ و تعبیر کے خلاف ہو بشرطیکہ روایت کے معیار پر پوری اترتی ہو۔ علّامہ شاطبی نے "الموافقات" میں لکھا ہے کہ: "پس حدیث قرآنی احکام و معانی کے لئے تفسیر اور شرح کی حیثیت میں ہوگی۔"

صحابہؓ کا طرزِ عمل | سنّت کی نسبت صحابہؓ کے طرزِ عمل پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا محمّد تقی امینی فرماتے ہیں کہ: رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے بعد سنّت پر اسی حیثیت سے عمل درآمد ہوتا رہا ہے۔ چنانچہ حضرت ابوبکر صدّیق رضؓ کا طرزِ عمل جو ہدایتِ الٰہی کی مزاج شناسی میں سب پر فوقیت رکھتے تھے۔ قانون کے بارے میں یہ منقول ہے کہ — حضرت ابوبکر صدّیق رضؓ کے سامنے جب کوئی قانونی معاملہ آتا تو پہلے قرآنِ حکیم میں اس کا حل تلاش کرتے، اگر وہاں نہ ملتا تو سُنّت کی طرف رجوع کرتے۔ اگر سنّت میں بھی نہ ملتا تو لوگوں سے دریافت کرتے کہ اس معاملہ میں رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے فیصلہ کا کسی کو علم ہے؟ بسا اوقات صحابہؓ ہی سے کچھ لوگ بتا دیتے کہ رسول اللہ صلعم نے اس معاملہ میں یہ فیصلہ فرمایا۔ سنّت سے سند مل جانے پر صدّیقِ اکبرؓ خوش ہو کر فرماتے کہ: "اللہ کا شکر ہے جس نے ایسے لوگوں کو باقی رکھا جن میں ہمارے نبی کی سنّتیں محفوظ ہیں۔" — حضرت عمرؓ نے ایک موقع پر فرمایا کہ: آئندہ ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو قرآنی شہادت میں تم سے جھگڑیں گے

ایسی صورت میں سنّتوں کے ذریعہ اُن پر حجّت قائم کرنا کیونکہ اصحاب سُنن کتاب اللہ کو خوب جانتے ہیں!"

ایک موقع پر سُنّت کی قانونی حیثیّت کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا لوگو! تمھارے لئے سنّتیں مقرّر کردی گئی ہیں، فرائض کی تعیین ہوچکی اس طرح تم کو واضح راستہ پر لگادیا گیا۔ اب اگر تم لوگوں کی وجہ سے دائیں بائیں دیکھوگے تو گمراہ ہوجاؤگے۔ اسی طرح دیگر صحابہؓ و تابعین کا بھی یہی عمل سنّت کے بارے میں منقول و محفوظ ہے اور سنّت کی نوعیّت اور مقام متعیّن کرنے میں ہمارے لئے دلیلِ راہ رکھتا ہے۔

ائمۂ قانون کا رویّہ ائمۂ قانون نے بھی قرآن فہمی اور قانون کے مرحلہ میں سنّت کو خاص اہمیّت دی ہے۔ امام ابوحنیفہ سے منقول ہے کہ "اگر سنّتیں نہ ہوتیں تو ہم میں سے کوئی قرآنِ حکیم کا فہم نہ حاصل کرسکتا!"۔ امام شافعی کا ارشاد ہے کہ: "مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ جب کسی پر رسول کی سُنّت واضح ہوجائے پھر اس کے لئے کسی کے قول کی وجہ سے اس کو چھوڑنا جائز نہیں!"۔ امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ: "جس نے رسول اللہؐ کی حدیث کو ردّ کیا وہ ہلاکت کے کنارے پر آگیا!"۔ مولانا فرماتے ہیں کہ ان تمام تصریحات سے دو باتیں معلوم ہوئی ہیں، پہلی یہ کہ قرآن فہمی میں سنّت کی تشریحات و توضیحات ہی کو اوّلیّت حاصل ہے اور دوسری یہ کہ سنّت قرآن حکیم کی شرح و تعبیر اور اصول رنگ میں اسی سے ماخوذ ہے۔

اسی سلسلے میں "ادارہ طلوعِ اسلام" کے بانی جناب غلام احمد پرویز کے بیان پر ستمبر ۱۹۶۸ء کی اشاعت میں ماہنامہ فکر و نظر کے ایڈیٹر پروفیسر محمد سرور صاحب نے مفصّل تبصرہ کیا تھا اور بھرپور جواب دینے کی کوشش کی تھی۔ اس تبصرہ پر ڈاکٹر فضل الرّحمٰن کا سنّت کی اہمیّت کے متعلّق ایک بیان کا اقتباس نقل کیا جاتا ہے جو کتاب اللہ کے ساتھ سنّت کی اہمیّت اور ضرورت پر کما حقّہٗ روشنی ڈالتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ:

"سب سے پہلے تو یہ ملحوظ رہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی ۲۳ سالہ جدّوجہد قرآن سے پوری طرح مربوط ہے۔ آخر قرآن کا نزول کوئی خلا میں تو نہیں ہوا۔ وہ آپ کی طویل جدّوجہد کے دوران آپ کی راہنمائی کرتا رہا، اس لئے ایک کو

دوسرے سے الگ کرنا نہ صرف ناممکن ہے بلکہ یہ غیر مستحسن بھی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس پس منظر کو سامنے رکھے بغیر، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مصروفِ عمل رہے اکیلے قرآن کا مطالعہ ناقابلِ فہم رہتا ہے۔ چنانچہ ان معنوں میں آپؐ کا عمل اتنی ہی بنیادی حیثیت رکھتا ہے، جس قدر قرآنی احکام۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی عمل ہے جسے سُنّت یا آپؐ کا اُسوۂ حسنہ سمجھنا چاہیئے۔ اسی کی روشنی میں ہم قرآن سمجھ سکتے اور اپنی روزمرّہ زندگی نیز قانون سازی کے لئے اس سے ہدایت اور راہنمائی حاصل کر سکتے ہیں!"

- احادیث کی اہمیت کے متعلق علامہ اقبال فرماتے ہیں:

"لہٰذا احادیث کا مطالعہ اگر گہری نظر سے کیا جائے اور ہم ان کا استعمال یہ سمجھتے ہوئے کریں کہ وہ کیا روح تھی جس کے ماتحت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے احکامِ قرآنی کی تعبیر فرمائی، تو اس سے ان قوانین کی حیاتیاتی قدر و قیمت کے فہم میں اور بھی آسانی ہوگی جو قرآنِ حکیم نے قانون کے متعلق قائم کئے ہیں۔ پھر یہ اُن اصولوں کی حیاتیاتی قدر و قیمت ہی کا پورا پورا علم ہے جس کی بدولت ہم اپنی فقہ کے بنیادی مآخذ کی از سرِ نو تعبیر اور ترجمانی کر سکتے ہیں!"

- پھر فرماتے ہیں کہ:

"بایں ہمہ یاد رکھنا چاہیئے کہ سب سے بڑی خدمت جو محدثین نے شریعتِ اسلامیہ کی سرانجام دی ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے مجرّد غور و فکر کے رجحان کو روکا اور اس کی بجائے ہر مسئلے کی الگ تھلگ شکل اور انفرادی حیثیت پر زور دیا۔!"

صحابہؓ کے طرزِ عمل اور ائمۂ قانون کے رویّہ اور ڈاکٹر فضل الرحمٰن اور علامہ اقبال مرحوم کے اقتباسات سے واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن حکیم کو سُنّت اور حدیث کے پس منظر سے الگ کر کے مطالعہ کرنا ہمیں اس کے صحیح فہم تک نہیں پہنچاتا۔ کسی بھی واقعہ یا تحریر کو اس کے تاریخی اور عملی پس منظر سے علیحدہ کرنا دراصل اسے بے جان اور مردہ کر دینے کے مترادف ہوتا ہے۔ جس کے بعد ہر شخص اپنے ذاتی خیالات کی روشنی میں اس کی تعبیر کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے اس تخلیقی مفہوم کو پورا کرنے سے محروم رہ جاتا ہے جس کے لئے وہ معرضِ وجود میں آیا تھا۔

آج قرآن حکیم کو نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی ۲۳ سالہ جدّوجہد اور اس کے تاریخی پس منظر سے علیٰحدہ کر کے مطالعہ کرنے کا انجام ہمارے سامنے ہے کہ کوئی بھی تفسیر و تشریح اتنی اہلیّت نہیں رکھتی کہ وہ قرونِ اُولیٰ کی طرح مسلمانوں کے تنِ مردہ میں پھر سے نئی جان پیدا کر دے۔

سُنّتِ رسول صلّی اللہ علیہ وسلّم کے مفہوم کے تعیّن، نظامِ مصطفیٰ کے نفاذ میں اس کی اہمیّت اور قانون سازی میں کتاب اللہ کے ساتھ سنّت سے استفادہ کی ناگزیری کے ثبوت کے بعد تصوّرِ سنّت کے دوسرے پہلوؤں کا جائزہ لینے کی کوشش کی جاتی ہے۔

لیکن اس جائزہ سے پہلے ایک بات کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ مسائلِ حیات، جن میں اسلامی مسائل بھی شامل ہیں، کو مطالعہ کرنا اور ان کی طرف تنقیدی رویّہ اپنانے کے دو طریق ہیں۔ ایک تیکانکی جس میں بندھے ٹکے خطوط اور پہلے سے قائم شدہ حدود کے دائرہ میں ہی رہتی ہے۔ اس سے باہر قدم نہیں رکھتی اور مطالعہ کنندہ یا ناقد اپنے مطالعہ اور تنقید میں اپنے عہد کے مخصوص معاشی سیاسی اور فکری تقاضوں کو شامل نہیں کرتا اور ان کی روشنی میں ان کی جانچ پرکھ نہیں کرتا۔ دوسرا تخلیقی جس میں موضوع کی حکمت اور لم کو سمجھ کر اپنے عہد کے فکری اور عمرانی مطالبوں اور تقاضوں کو بھی شامل کرتا ہے اور ان کا حل تلاش کرتے ہوئے پہلے سے قائم شدہ حدود سے باہر نکل کر ان سے روشنی حاصل کرتا ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں مولانا ابوالکلام آزاد، علاّمہ اقبال، ڈاکٹر فضل الرّحمٰن، امام عبیداللہ سندھی اور مولانا محمد نقی امینی جیسے اصحاب اس تخلیقی مطالعہ کرنے والے مدرسۂ فکر سے تعلّق رکھتے ہیں۔ یہ واضح رہے کہ یہ دونوں منہاج اپنے پس منظر میں دو مختلف تصوّرِ حیات و کائنات اور عملی مسائل کی طرف مختلف رویّوں کے حامل ہیں۔

چنانچہ تخلیقی منہاج کے مطالعہ سے سنّتِ رسول اللہ صلّی کے تصوّر کے کئی ایک پہلو سامنے آتے ہیں، جن میں سے یہاں صرف تین کا ذکر کیا جائے گا۔ ایک قبل از نبوّت جسے سُنّتِ تحنّث کہا جا سکتا ہے۔ دوسرا بعد از نبوّت مکّی دَور اور

تیسرا مدنی دَور سے متعلق ہے جب مملکت وجود میں آچکی تھی۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ عام طور پر سنّت کی اصطلاح کو یا تو فقہی اور قانونی حدود تک محدود رکھا گیا ہے یا پھر حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ذاتی حالات وشمائل کے لئے یہ لفظ استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ اس مفہوم میں قبل از نبوّت اور مکی دَور کے نبوی عمل کو زیرِ غور نہیں لایا گیا۔ چونکہ مدینہ طیّبہ کی نئی مملکت کے استحکام اُسے دشمن کی دست بُرد سے محفوظ رکھنے اور معاشرتی اداروں کو نئی اساس پر تعمیر کرنے کے تقاضے اوّلین حیثیّت رکھتے تھے۔ اس لئے اس انہماک میں پہلی دونوں باتوں کی طرف دھیان نہیں دیا جاسکا۔ بعد میں یہی رویّہ قرآنِ حکیم کی شرح وتعبیر میں بھی اپنا لیا گیا اور اسلامی آئیڈیالوجی اور اسے معاشرتی سطح پر قائم کرنے کے لئے نبیِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی مکّی دَور میں مخالف قوّتوں کے خلاف جدّوجہد کو نظرانداز کر دیا گیا۔ میرے نزدیک ایک تصوّرِ سنّت کے پہلے دو پہلوؤں کی اہمیّت اس کے تیسرے یعنی مدنی پہلو سے کسی طرح کم نہیں ہے۔

لہٰذا غارِ حرا میں عملِ تحنّث کے مضمرات پر جب ہم غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ قبل از نبوّت نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم اپنے عربی معاشرہ اس کے اردگرد رومی وایرانی سامراجوں کی وجہ سے جو معروضی حقیقتیں موجود تھیں ان کا غائر مطالعہ فرمایا کرتے تھے۔ مکی دَور کے قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد کے سیاسی معاشی اور فکری نظامات، معاشرہ کی طبقاتی ترکیب (COMPOSITION) رومی وایرانی سامراجوں کے عمرانی، فکری اور نفسیاتی اثرات، یہودی ونصرانی اسباطینِ مذہب کی دینِ ابراہیمی کے مقاصد وغایات سے علیحدگی، اور یونان، ہند، ایران اور اسکندریہ کے علمی مراکز سے اٹھنے والے فلسفیانہ دبستانوں کے افکار سے حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام نہ صرف آگاہ تھے، بلکہ اُن پر تنقیدی نظر بھی رکھتے تھے۔ ان حالات کے مطالعہ سے پیدا ہونے والے نظریاتی الجھاؤ کو اگرچہ وحیِ الٰہی کی روشنی نے حل کیا اور روحِ الٰہی کی مدد سے جدّوجہد کے ہر مرحلہ پر آپ کی راہنمائی کرتی رہی۔ مگر اس سے ان افراد کے لئے جو اپنے اندر فکری صلاحیّت رکھتے ہیں، سنّتِ تحنّث کی اہمیّت کم نہیں ہوتی۔ اگر نبی کے ساتھ وحیِ الٰہی کی مدد ہوتی ہے تو غیر نبی کے ساتھ وجدان کی

• روشنی موجود ہوتی ہے، بلکہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم تو قرآن کے تتبع میں وحی کو زندگی کی عالمگیر حقیقت تصوّر کرتے ہیں اور تمام علوم و ایجادات کو وحیٔ الٰہی کے عمل کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ یوں تو ہر سال رمضان المبارک کے آخری عشرے میں اعتکاف کی شکل میں اس سنّتِ مطہرّہ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور ہمارے صوفیائے کرام نے اپنے لطائفِ قدسیّہ کی بیداری اور انجلائے نفس کے لئے اس سنّت سے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔ مگر اس کے عمرانی اور فکری پہلو پر زیادہ غور و خوض نہیں کیا گیا۔ میرے مطالعے میں نئے فکری نظامات اور نئے معاشرتی حقائق کی تخلیق کے لئے سنّتِ تحنّث کی افادیت کا اقرار شاید علامہ اقبال ہی نے کیا ہے، انہوں نے کہا ہے :

درشبستانِ حرا خلوت گزید ؛ قوم و آئین و حکومت آفرید

● دوسری جگہ کہا ہے کہ :

مصطفیٰ اندر حرا خلوت گزید ؛ مدّتے جز خویشتن کس را ندید

نقشِ ما را در دل او ریختند ؛ ملّتے از خلوتش انگیختند

تحنّث کا عمل اپنے مافیہ (C O N T E N T) میں غیر جانبدار، آزاد اور صاف ستھرے ذہن کے ساتھ اپنے عہد کے معروضی معاشرتی حالات اور معاملات کا مطالعہ کرنا اور انہیں نئی ارتقائی منازل کی طرف سے چلنے کے لئے نئی آئیڈیالوجیکل بنیادوں کی تلاش کرنا اور معاشرہ کو موجودہ حالات (S T A T E S Q U O) میں باقی رکھنے والی رجعت پسند قوتوں کے خلاف مسلّح یا غیر مسلّح جدّ و جہد کے طور طریقوں کو سوچنے پر مبنی ہوتا ہے۔ میرے نزدیک ختمِ نبوّت کے مشمولات میں سے ایک سنّتِ تحنّث بھی ہے، جسے اپنانے یا نظر انداز کرنے کے منفی اور مثبت اثرات بعد میں آنے والی مسلم اور غیر مسلم تاریخ میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ اس تلخ حقیقت کو اکرنا پڑتا ہے کہ مسلم مفکّرین نے اس سنّتِ جلیلہ سے بہت کم فائدہ اٹھایا اور جس کی وجہ یورپ کی نشاۃِ ثانیہ تک یادہ سو برس میں قرآنِ حکیم کے سیاسی، معاشی اور فکری عائلی نصب العینوں اور مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے ملوکیت سے بہتر کسی سیاسی نظام اور جاگیرداری سے زیادہ ترقّی یافتہ کسی معاشی نظام کی تدوین عمل میں آ سکی۔

اور نہ ہی قرآن کی روشنی میں معاشرتی حرکت کوئی انتہائی اور آخری سمت یا منزل کا تعین ہو سکا۔ جس تک پہنچنے کے لئے مسلم معاشرہ اپنی ساری ذہنی اور عملی قوتوں کا رُخ موڑ سکتا۔ اسی عرصہ میں بغداد اور قرطبہ کے مراکز سے مسلم دانش نے اگر کسی نئے معاشرتی اور فکری نظام کا کوئی خاکہ سوچا بھی تو تقلید پسند مذہبی ذہن اور صاحبِ اقتدار طبقہ کے اتحاد نے اسے جیتی جاگتی معاشرتی حقیقت میں تبدیل نہ ہونے دیا اور اس طرح فارابی اور ابن ماجہ کے معاشرتی خاکے اور ابن عربی اور مولانا جلال الدین رومی کے فکری تصورات دھرے کے دھرے رہ گئے اور مسلم معاشرہ قدامت پسند لوگوں کی قیادت میں اپنی منطقی تباہی کی منزل کی طرف رواں دواں رہا۔

یہ پھر یورپ تھا جس نے اسلامی مشرق سے فکری و عمرانی علوم حاصل کر کے اپنی آزاد اور غیر جانبدار عقلیت کے غور و تدبّر سے انہیں اَوجِ ثریّا تک پہنچا دیا۔ ابنِ رشد کے فلسفہ اور مالکی فقہ نے مغربی ذہن کو نئے معاشرتی اور فکری افقوں سے روشناس کرایا اور وہاں نئے سیاسی، معاشی اور فلسفیانہ نظامات کی بنیادیں استوار ہوئیں ـــــ!!

آج بھی پاکستانی معاشرہ میں نظامِ مصطفےٰ کے نفاذ کی حمایت یا مخالفت میں ہم یا تو مغربی یورپ کی طرف دیکھتے ہیں یا پھر بارہ سو برس قبل کے مدوّن شدہ فقہ و فلسفہ پر اپنی زندگی کی بنیادیں استوار کرنا چاہتے ہیں۔ مگر آزاد اور غیر جانبدار ذہن کے ساتھ اپنے عہد کی مخصوص سیاسی، معاشی اور فکری حقیقتوں کا مطالعہ کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ سُنّتِ تحنّث اور اس کی فکری اور معاشرتی افادیت پر غور کرنے کے بعد تصوّرِ سنّت کے دوسرے پہلو یعنی نبوی ل کے مکی دَور کو جب زیرِ مطالعہ لاتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے سامنے ایک ایسا معاشرہ ہے اور ایسے بین الاقوامی حالات ہیں جن میں استحصالِ محنت، عورت اور غلام کی تذلیل اور محکومی، جنسی آوارگی، عصمت فروشی، مالدار طبقوں کی بالادستی، نسلی منافرت، قمار بازی اور ظلم و جبر جیسی معاشرتی برائیاں موجود ہیں اور پھر روم و ایرانی سامراجی قوّتوں کی لوٹ کھسوٹ اور مسلسل باہمی جنگوں کی وجہ سے تباہ حال قومیں پائی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ یہودی، نصرانی اور دوسرے ادیان کی تعلیمات سے

اس کے پیروؤں کی بے اعتنائی اگرچہ بڑے بڑے عظیم الشان معبد موجود ہیں اور کتبِ الٰہی کے مفسّر و شارح بھی ہیں اور مذہب کے نام پہ بڑی مضبوط اور منظّم کلب کی تنظیمیں بھی موجود ہیں مگر مذہبی حقیقت گم ہو چکی ہے۔ اس تمام صورتِ حال کو بدلنے کے لئے تیرہ برس تک ایک جاں گسل اور تاباک جدّوجہد کا آغاز کیا گیا۔ غائر مطالعہ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس ساری تباہ حالی اور مفاسد کا ذمّہ دار صرف معترضین کے طبقہ کو قرار دے کر جدّوجہد کا رخ اس طبقہ کو اقتدار اور استحصال شدہ دولت سے الگ کرنے کی طرف تھا۔ جیسا کہ مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی نے سورۂ بنی اسرائیل کی سولہویں آیت کی شرح میں بتایا ہے کہ یہ طبعی اور فطری عالمگیر قانون ہے کہ قوموں کی تباہی کا باعث مترفین طبقہ کی بداعمالیاں ہوتی ہیں۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ہے کہ مکّی دَور کی جدّوجہد کا مفہوم یہ ہے کہ محکوم اور پس ماندہ معاشروں میں نئی زندگی پیدا کرنے اور ان کی معاشی، سیاسی، ذہنی حالت کو بدل کر انہیں انسانی سطح پہ لانے کے لئے مترفین طبقوں کی دولت اور اقتدار پر سے بالادستی ختم کی جائے تاکہ افرادِ معاشرہ کے معاشی اور تہذیبی حالات میں فارغ البالی، ذہنی آزادی اور حُسن پیدا ہو سکے اور انسان جو مجموعی طور پہ اپنی محنت کی پیداوار، ایک دوسرے انسانوں سے باہمی تعلّقات کی اخلاقی اور انسان دوستی کی اساس اور سب سے بڑھ کر اپنے نوعی تقاضوں سے علیٰحدہ ہو چکا ہے اور غیر انسانی ماحول میں زندگی بسر کر رہا ہے۔ اپنی فردوسِ گم گشتہ کو پھر سے حاصل کر کے اپنی تخلیقی غایت کو حاصل کر سکے۔ شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی نے "حجّۃ اللہ البالغہ" میں بعثتِ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی غرض و غایت یہی بتائی ہے۔

میرے نزدیک رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی اخلاقی اور معاشرتی صحّت کے لئے مکّہ کے مالدار طبقہ کے خلاف انقلابی جدّوجہد بھی ختمِ نبوّت کے متضمنات میں سے ہے مکّی دَور کے اس سارے (PERSPECTIVE) سے مسلمان تو کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے مگر پھر یہ یورپ ہی تھا جس نے سُنّتِ تحنّث کے بتائے ہوئے راستہ پر چل کر اپنی معاشرتی قوّتوں کو جاگیرداری اور ملوکیّت کے قبضہ سے آزاد کرا لیا۔ اس طرح وہاں کی زندگی کے حوالی میں فکری اور معاشرتی انقلابات کا سلسلہ شروع ہو گیا جو بالآخر انقلاب

فرانس کے بعد انقلابِ روس پر منتج ہوا۔

مکّی دَور کی اس سنّتِ عظیمہ کو نظر انداز کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ غیر مسلم پسماندہ اور محکوم معاشروں کو سامراجی غلامی اور نکبت و افلاس کی ظلمتوں سے نکال کر انہیں حرّیت و خوشحالی کی روشنی میں لانا تو ایک طرف رہا خود مسلمان معاشرے بتدریج محکومی اور افلاس و جہالت کی پستیوں میں گرتے چلے گئے، اور حالت یہ ہو گئی کہ اگر کسی مسلم معاشرہ کو اپنی زبوں حالی پر آگہی حاصل بھی ہوتی اور اپنی آزادی و خوشحالی کے لئے اس نے جدّ و جہد بھی شروع کی تو دلّی کے اربابِ بست و کشاد کو نظریاتی سیاسی اور معاشی وجدان حاصل کرنے کے لئے دوسروں کی طرف دیکھنا پڑا۔ الجزائر، شام، مصر فلسطین، یمن، ترکی اور دوسرے مسلم معاشروں نے اپنی جدّ و جہد میں نظریاتی، اور مادّی امداد زیادہ تر یا تو اشتراکی روس سے حاصل کی اور یا پھر مغربی یورپ سے۔ اگر مسلم دانش نے مکّی دَور کی جدّ و جہد کے ما فیہ اور اس کے مطویات پر غور کیا ہوتا تو اسے نہ صرف یہ کہ غیروں کی طرف نہ دیکھنا پڑتا بلکہ سیاسی آزادی، معاشی خوشحالی اور تہذیبی ارتقاء کا وہ پرچم جو آج مغربی یورپ کے بعد اشتراکی قوّتوں کے ہاتھ میں خود مسلمانوں کے ہاتھ میں ہوتا، اور اقوامِ عالم کی قیادت اُن کے نصیب میں لکھی ہوئی ہوتی یعنی مگر تو اپنی خودی نہ کھوتا، زُنّاری برگساں نہ ہوتا۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ پہلی صدی ہجری کے وسط سے ہی ہم نے اپنی راہوں کو جن خطوط پر بدلنا شروع کیا تھا، اس کے منطقی نتائج آج ہمارے سامنے ہیں۔ کائنات اور معاشرہ میں پائی جانے والی ارتقاء پذیر حرکت کی نفی، زندگی کا جامد اور ٹھوس تصوّر، آبائی تقلید پر راسخ عقیدہ، اسلام کی عالمگیر، انقلابی اور انجذابی (ASSIMILATIVE) اقدار سے بے اعتنائی، ذہنی لحاظ سے مفلس مگر منظّم مذہبی پیشوائیت کی مضبوط گرفت اور ایسے ہی دوسرے ظلمت پسند، منفی اور بانجھ تصوّرات نے کچھ اس طرح ہمیں گھیر رکھا ہے کہ حالات کی ستم ظریفی سے تنگ آ کر ہم کبھی اس سے نکلنے کی کوشش بھی کرتے ہیں تو مزید گرفتار ہو جاتے ہیں۔ شاید اس لئے کہ جنّت سے نکلنے کے بعد آدمی بیگانگیٔ ذات (SELF-ALIENATION) کے جس بھنور میں پھنس گیا تھا، ہم نے بعثتِ انبیاء کی تحریک کو اس تاریخی پس منظر میں رکھ کر کبھی مطالعہ کرنے کی کوشش

ہی نہیں کی اور اُس میٹافزکس کے عمرانی، نظریاتی اور جمالیاتی مضمرات پر کبھی غور ہی نہیں کیا، جس کی اساس پر رحمۃٌ للعالمین نے اپنی تاریخ ساز جدّوجہد شروع کی تھی۔

غارِ حرا میں تحنّث کی سنّت جلیلہ اور مکّی دَور میں فاسد اور محکوم معاشرہ کو بدلنے کے لئے جدّوجہد کی سنّتِ عظیمہ کے مقابلے میں مدنی دَور کی سنّت کے مقاصد اور غایات مختلف ہیں۔ یہاں انقلاب کی کامیابی کے بعد نئی مملکت کی بنیادوں کو استوار کرنا اُسے داخلی اور خارجی مخالف قوّتوں سے محفوظ رکھنا اور قدیم معاشرہ کی کوکھ سے تخلیق پانے والے نئے معاشرتی، تعلیمی اور تہذیبی اداروں کو ان کے مابعد الطبیعاتی اساس کے منطقی تقاضوں کے مطابق قائم کرنے اور پروان چڑھانے کی کٹھن منزل درپیش تھی اس سارے PROCESS میں دو اہم سوالات سامنے آتے ہیں ـــــ پہلا سوال یہ ہے کہ وہ کیا منہاج (METHOD) تھا جس کے ذریعے نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم قرآن کی دائمی اور عالمگیر ہدایات سے مخصوص عربی معاشرہ کے لئے قوانین اخذ کرتے تھے؟ دوسرا کہ یہ اخذ کردہ قوانین جنہیں فقہی زبان میں سنّتِ رسولؐ کہا جاتا ہے۔ دائمی حیثیّت رکھتے تھے یا بدلتے ہوئے حالات میں انہیں بھی تبدیل کیا جا سکتا ہے؟

دونوں سوالات کا جواب تو بہت تفصیل طلب ہے، جس کی یہ مختصر سی صحبت کفیل نہیں ہو سکتی۔ البتّہ نہایت اختصار سے بات کی جا سکتی ہے۔ موجودہ عہد میں کُرۂ ارض پر پھیلے ہوئے مختلف تہذیبوں اور معاشرتی حالات کے حامل مسلم معاشروں میں اسلام کو زندہ، فعّال، حیات افروز اور حیات ساز عنصر کی حیثیّت سے از سرِ نَو واپس لانے کا عمل ان سوالات کے صحیح جوابات پر انحصار رکھتا ہے اس جائزہ میں سب سے پہلی بات یہ سامنے آتی ہے کہ قرآنِ حکیم اپنے تصوّرِ حیات و کائنات میں فطرت اور انسانی معاشرہ میں جو فطرت کا ہی ایک حصّہ ہے کسی التقائی اور تخلیقی تحریک کے وجود کو تسلیم کرتا ہے یا نہیں، جو بتدریج ایک متعیّن منزل یا سمت کی طرف محوِ سفر ہے اور اپنے اس سفر میں وہ ہر بار اپنے سابق مرحلہ سے زیادہ وسیع، برتر اور پر مایہ مرحلہ میں قدم رکھتی ہوئی آگے بڑھتی جا رہی ہے۔ دوسرے

لفظوں میں ہمیں سُنّتِ رسولؐ کی نظریاتی بنیاد کو جانچنا پڑے گا۔ دوسری فیصلہ طلب بات یہ ہے کہ بعثتِ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی حیثیت کو متعیّن کرنا ہوگا یعنی آپ ساری اقوامِ عالم کی طرف قیامت تک کے تمام عہدوں کے لئے مبعوث ہوئے تھے یا ایک مخصوص عہد میں محض عرب معاشرہ کی اصلاح کے لئے ؟

ہم دیکھتے ہیں کہ ظہورِ اسلام کے وقت یونان، ہند، ایران اور اسکندریہ کے علمی مراکز میں کائنات، حقیقتِ مطلقہ اور انسانی معاشرہ کے متعلق تین رویّے پائے جاتے تھے۔ ایک یہ کہ حرکت و تغیّر (MOVEMENT AND CHANGE) کا کوئی وجود نہیں ہے۔ دوسرا یہ کہ حرکت تو موجود ہے مگر دُوری (CYCLIE) ہے۔ تیسرا یہ کہ حرکت ارتقاء پذیر یعنی (SPIRAL) ہے۔ قرآنِ حکیم نے پہلے دونوں رویّوں کو ردّ کر دیا، اور تیسرے رویّہ کی تائید کی، یعنی تخلیق اور تاریخ کا ہر دَور اپنے ماقبل دَور سے ترقی یافتہ ہوتا ہے اور ترقّی یافتہ ہونے کی وجہ سے اپنے ماسبق دَور سے مختلف اور نئے مطالبات اور تقاضوں کا حامل ہوتا ہے۔ جنھیں حاصل کئے بغیر حیاتِ انسانی نہ تو پُرامن اور بارآور ہو سکتی ہے اور نہ ہی آگے قدم بڑھا سکتی ہے اور یہ ارتقائی حرکت ایک متعیّن منزل یا نصب العین بھی رکھتی ہے جس کے حصول کے لئے وہ مرحلہ بمرحلہ آگے ہی آگے بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ علّامہ اقبال مرحوم نے اس مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا ہے کہ۔ UNIVERSE IS CHANGEABLE IN ITS NATURE TO INCREASE AND FINITE۔

کائنات اپنی فطرت میں تغیّر پذیر ہے، ارتقاء پذیر ہے اور محدود یعنی اپنی ایک انتہائی منزل رکھتی ہے۔ لہٰذا کوئی فکر، کوئی عمل اور کوئی قانون آخری اور قطعی نہیں ہوتا بلکہ وہ حرکت کے ارتقاء یافتہ مرحلہ میں قدم رکھنے کے ساتھ ہی تبدیل ہو جاتا ہے۔ قدیم افکار اور معاشرتی ادارے مر جاتے ہیں اور نئے ان کی جگہ لے لیتے ہیں۔

دوسری بات کے متعلق نبی اکرمؐ کے خاتم النّبیّن ہونے کی وجہ سے ان کی حیثیت عالمگیر اور دائمی ہو گئی ہے۔ اس لئے کسی مخصوص دَور کے فیصلے آنے والے دَور پر خارجی اور میکانکی طور پر منطبق نہیں کئے جا سکتے۔ ہر دَور مسائل کے متعلق اپنے فیصلے خود کرتا ہے، البتہ پہلے ادوار کے فیصلے مستقبل کے ادوار کے لئے "نظیر" کی حیثیت

اختیار کر سکتے ہیں۔ سنّت کے اس پہلو پر امام رازی نے مطالب عالیہ میں، ابنِ رشد نے فصل المقال اور کشف الادلّہ میں، مولانا شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی نے "حجۃ اللہ البالغہ" میں ڈاکٹر فضل الرّحمٰن نے "اسلامی منہاج تاریخ کے آئینے میں" کے اندر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

سنّت کے موضوع پر ڈاکٹر فضل الرّحمٰن نے اپنی کتاب: ———

"THE ISLAMIC METHODOLOGY IN HISTORY."

میں نہایت دقیق بحث کی ہے۔ یہاں چند لفظوں میں اس کے مرکزی مباحث کو بیان کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک سنّت کوئی جامد تصوّر نہیں ہے۔ انہوں نے مدنی معاشرہ میں سُنّتِ نبویؐ کے متعلّق: "زندہ اور جاری سُنّت!" کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ امام ابو یوسف اور شامی فقیہ امام اوزاعی کے باہمی فقہی اختلاف پر بحث کرتے ہوئے سنّت کے دو مفہوم سامنے لائے ہیں یعنی سنّت ایک طرف اس عمل کے اعتبار سے جو مسلمانوں میں رائج تھا اور دوسری طرف اس خصوصی عمل کی رُو سے جو رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم سے فتح مکّہ اور دوسرے مواقع پر سرزد ہوا۔ دونوں فقیہ اپنے اختلافات کے اظہار میں لفظِ "سنّت" ہی استعمال کرتے ہیں۔ سنّت کے مفہوم کو دوسری صدی ہجری میں جب احادیث کی تدوین عمل میں آچکی تھی، جس طرح متعیّن کیا گیا، اور اوائل مدنی معاشرہ میں جو مفہوم لیا جاتا تھا اس کا تقابل کرتے ہوئے انہوں نے کہا ہے کہ: "جب ہم سُنّت کو ایک ٹھوس اور متعیّن شکل دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ یعنی وہ سُنّت جو اُمّت کے واقعی عمل سے عبارت ہے تو ہمیں سُنّتِ رسولؐ کی اس آزاد تعبیر میں اور زمانہ مابعد کے فقہا کے سنّت کے جامد اور بے لچک عقیدہ کی تشکیل کی، ان دونوں میں ایک عجیب و غریب بُعد نظر آتا ہے۔ یہاں صورتِ حال کی خصوصیات کے اعتبار سے رسولؐ اللہ کے عملی و کردار کی ایک حرکت پذیر لہر ہے جو آزادی کے ساتھ رواں ہے۔ وہاں چند جامد قواعد و ضوابط ہیں جو ایک بار وضع کئے جانے کے بعد ہمیشہ ایک حالت میں رہتے ہیں۔ یہاں جن مقاصد و غایات کے حصول کے لئے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم سرگرداں تھے، ان کی مسلسل اور انتھک تلاش و جستجو ہے وہاں ضوابط کا ایک بے لچک اور متعیّن نظام ہے

جس کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تحریفات کے آہنی شکنجہ میں کس دیا گیا ہے۔ دوسری جگہ انہوں نے امام ابو یوسف کی ائمۂ فقہاء کے متعلق یہ رائے دی ہے کہ امام ابو یوسف کے نزدیک ائمۂ فقہاء سنتِ نبویؐ کی توسیع اور زندہ سنت کی تخلیق کرنے کا کام سرانجام دے رہے ہیں!"

علامہ اقبال مرحوم نے اپنے چھٹے خطبہ میں جس کا عنوان :

"THE PRINCIPLE OF MOVEMENT IN THE STRUCTURE OF ISLAM."

اس موضوع پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا ہے کہ :" مجھے اس امر کا یقین ہے کہ جونہی فقہ اسلام کا مطالعہ غائر نظروں سے کیا گیا۔ اس کے موجودہ ناقدین کی یہ رائے بدل جائے گی کہ اسلامی قانون جامد یا مزید نشوونما کے ناقابل ہے۔!"

امام عبید اللہ سندھی نے حکمت اور فقہ کے امتیاز اور باہمی تعلق پر قابلِ قدر بحث فرمائی ہے۔ اُن کے نزدیک سُنّتِ نبویؐ قرآنِ حکیم کی دائمی حکمت کا عربی جامہ ہے، جس کی نظیر کو سامنے رکھ کر ہر عہد کے فقہاء نے اپنے اپنے مخصوص جاموں کو تیار کیا۔ انہوں نے امام شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی کے حوالے سے سنّت کے مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے۔ امام شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی نے تفہیمات کی جز اوّل میں :" النبوّۃ تحت الفطرۃ" کے عنوان کے ماتحت بتایا ہے کہ :" کسی قوم میں جب کوئی نبی مبعوث ہوتا ہے تو وہ اپنی قوم کے حالات پر نظر ڈالتا ہے اور اُن کے اعتقادات اور اعمال کو دیکھتا ہے، جو اعمال اور اعتقادات تہذیبِ نفس کے لئے مفید و معاون ہوتے ہیں ان کو تو وہ رہنے دیتا ہے اور اُن پر عمل پیرا ہونے کے لئے اپنی قوم کو دعوت دیتا ہے، اور جو تہذیبِ نفس کے لئے مضر ہوں، اُن سے منع کرتا ہے۔ پھر فرمایا کہ نبوّت کا اصل مقصد تہذیبِ نفس ہوتا ہے تاکہ انسان میں جو بھی استعداد ہو وہ اپنے کمال کو پہنچ سکے!"

اس اقتباس سے اس منہاج کا بھی تعیّن ہوتا ہے جس کے ذریعے نبوّت اپنے مخصوص معاشرہ میں سُنّت اللہ کے عالمگیر اصولوں سے قوانین اخذ کرتی ہے۔ علامہ شبلی نعمانی مرحوم " الکلام" میں شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی کے حوالے سے اس مسئلہ پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :" اوپر بیان ہو چکا ہے کہ پیغمبر جس

قوم میں مبعوث ہوتا ہے اس کی شریعت میں اس قوم کی عادات اور خصوصیات کا خاص طریقے پر لحاظ ہوتا ہے، لیکن جو پیغمبر تمام عالم کے لئے مبعوث ہوا اس کے طریقۂ تعلیم میں یہ اصول نہیں چل سکتا کیونکہ نہ وہ تمام دنیا کی قوموں کے لئے الگ الگ شریعتیں بنا سکتا ہے اور نہ ہی تمام قوموں کی عادات اور خصوصیتیں باہم متفق ہو سکتی ہیں۔ اس لئے وہ پہلے اپنی قوم کی تعلیم و تلقین شروع کرتا ہے اور اسے محاسنِ اخلاق کا نمونہ بناتا ہے۔ یہ قوم اس کے اعضاء و جوارح کا کام دیتی ہے اور اس کے نمونہ پر وہ اپنی تلقین کا دائرہ وسیع کرتا جاتا ہے۔ اس کی شریعت میں اگرچہ زیادہ تر وہ قواعد کلیہ اور اصول عامہ ہوتے ہیں جو قریباً تمام دنیا کی قوموں میں مشترک ہیں۔ تاہم خاص اُس کی قوم کی عادات و خصوصیات کا لحاظ زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن جو احکام ان عادات اور حالات کی بناء پر قائم ہوتے ہیں ان کی پابندی سے مقصود بالذات نہیں ہوتی اور نہ ان پر چنداں زور دیا جاتا ہے!"

آخر میں مولینا محمد تقی امینی کے افکار سے کچھ اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔ پہلے عرض کیا گیا ہے کہ مولانا موصوف نے کتاب اور 'نبی' کو نقشہ اور انجینئر سے تعبیر کیا ہے، اسی سلسلہ میں آپ فرماتے ہیں کہ :

"البتہ حالات و مقتضیات کی رعایت ہر دور کی عمارت میں کی جاتی ہے، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تیار کی ہوئی عمارت میں بھی اس کی رعایت موجود ہے۔ ہمارا کام یہ ہے کہ عمارت کی اصل بنیاد اور ستون باقی رکھ کر اس رعایت سے جتنا فائدہ بھی اٹھا سکتے ہیں اٹھائیں اور اپنے زمانے کے مناسب عمارت تعمیر کریں ——!!"

مولانا موصوف کے ایک مقالہ سے جو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی تھیالوجیکل سوسائٹی کی طرف سے یونین ہال میں پڑھا گیا تھا۔ ماہنامہ فکر و نظر نے کچھ اقتباسات شائع کئے تھے، اُن میں سے چند ایک یہاں پیش کئے جاتے ہیں، آپ فرماتے ہیں :

"ہدایتِ الٰہی کسی معاشرے کو وجود میں نہیں لاتی ہے بلکہ انسان کے ہاتھوں معاشرہ وجود میں آتا ہے، جس میں خیر و شر دونوں کی نمود اور خوبیوں کے ساتھ خامیوں کا ظہور ہوتا ہے!" پھر فرمایا کہ : "ہدایتِ الٰہی اپنے نزول کے زمانے میں اس

وقت کے معاشرے کو محض خیر و شر کی نسبت سے بطورِ نمونہ پیش کرتی ہے اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انسان اپنی صلاحیتوں اور توانائیوں سے دستبردار ہو کر زندگی کی گاڑی کو اسی معاشرے پر چلاتا ہے اور ترقی یافتہ عمارت کے مقابلے میں ہمیشہ اسی عمارت کی طرف دعوت دیتا ہے۔ مقصود عمارت نہیں ہوتی بلکہ خیر و شر کی وہ نسبت اور عدل و اعتدال کی [illegible]ت ہوتی ہے جو ہدایتِ الٰہی کے ذریعہ پیدا ہوتی ہے اور بطورِ نمونہ اسی کو پیش کرتی ہے !"

پھر فرمایا کہ :۔ "معاشرہ فطری افتاد کے مطابق ترقی کرتا اور بدلتا رہے گا۔ اس کو نہ کسی کا جمود روک سکتا ہے اور نہ کسی قوم کا زوال بریک لگا سکتا ہے۔ اب اگر کسی کو جمود توڑنا اور زوال کو ختم کرنا ہے تو ذہنی اور فکری تبدیلی کے ساتھ اس کے اپنے زمانہ کی تنظیمی، ترقیاتی چیزوں کو قبول کرنا ناگزیر ہے !"——!!

پھر فرمایا کہ :۔ "جدید معاشرہ کی رہنمائی کے لئے بنیادی نقطۂ نگاہ یہ بنانا پڑے گا کہ اگر اس وقت ہدایت کے نزول کا زمانہ ہوتا اور محسنِ کائنات خود بنفسِ نفیس تشریف فرما ہوتے تو آپؐ جلبِ منفعت اور دفعِ مضرت کا کس قدر لحاظ فرماتے اور معاشرتی فلاح و بہبود کی چیزوں میں کسی جذبہ کو ملحوظ رکھتے۔ اس سلسلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانے کے معاشرے کو "ہدایت" کے سانچے میں ڈھالنے کے لئے "اِزالہ" (REPLACEMENT) کی بجائے 'اِمالہ' (ADDITION) کی جو روش اختیار فرمائی ہے اور ترمیم و تنسیخ نیز تدریج و تخفیف کے جن اصول و ضوابط سے کام لیا ہے وہ سب جدید معاشرہ کی رہنمائی کے لئے دلیلِ راہ کی حیثیت رکھتے ہیں !"

مولانا موصوف نے اپنی ایک اہم تصنیف "احکامِ شرعیہ میں زمانہ اور حالات کی رعایت !" میں تفصیل کے ساتھ اس موضوع پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کتاب سے چند اہم باتیں پیش کی جاتی ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ :۔ "مسلم قوم کے زوال نے ایک نئے دَور کو جنم دیا ہے۔ اس نئے دَور کے نظریات نے ایمان اعتقاد کی بنیادیں ہلا دی ہیں اور معاشرہ کی تشکیل نے مذہب و زندگی کے ہر شعبہ میں بے شمار نئے مسائل پیدا کر دیئے ہیں۔ پہلے تجدید دین کی بات ایک معاشرہ تک محدود تھی۔ اب اس کا تعلق ایک دَور

سے مل گیا ہے !۔ پھر فرماتے ہیں :۔ پچھلا دَور اپنی سابقہ شکل میں پھر واپس نہیں آتا ہے۔ قانونِ فطرت کے مطابق کوئی دَور اس طرح ختم نہیں ہوتا کہ وہ دوبارہ اپنی شکل میں واپس آئے اور کوئی دُنیا اس لئے نہیں لُٹتی ہے کہ وہ اپنی سابقہ حالت پر پھر آباد کی جائے ..... اس بناء پر یہ توقع فضول ہے کہ سابق دَور واپس آئے گا اور اس کے معاشرہ میں ملکی و معاشرتی قانون علیٰ حالہٖ نافذ ہوں گے۔ اب نئی دُنیا کو قبول کئے بغیر چارہ نہیں ہے !"

پھر فرمایا کہ :۔" مذہب کی نمائندگی جس انداز سے ہو رہی ہے اس میں بڑی حد تک فکر و عمل کی وہی خصوصیتیں موجود ہیں جو دَورِ زوال کی یادگار ہیں اور جن کو زمانی تبدیلیوں نے پائمال بنا دیا ہے۔ چنانچہ اس امر پر سب کو اتفاق ہے کہ اسلام زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے۔ لیکن ان شعبوں کی تفسیر و تعبیر میں اب تک جاگیردارانہ ذہنیّت کا مظاہرہ ہو رہا ہے۔ !"

پھر فرمایا کہ :" یہ کام جرأت و ہمّت اور کھُلے دماغ کے ساتھ براہِ راست غور و فکر کے بغیر سرانجام نہیں پا سکتا۔ لیکن مذہب کے نام پر مختلف برادریاں اور گروہی تعلّقات کی جکڑ بندیاں کچھ اس طرح گرفت میں لئے ہوئے ہیں کہ اُن سے صرفِ نظر کر کے جرأت و ہمّت کے مظاہرے کی توقع بے سُود ہے اور ان کو ساتھ لے کر کھلے دماغ کے ساتھ کسی فیصلے کی امید بے کار ہے !"

پھر فرمایا کہ :" اندازِ فکر بدلنے کی ضرورت ہے۔ مذہب اب تک قدیم تنظیم کو سمجھا جا رہا ہے چونکہ اس کا دَور ختم ہو چکا ہے۔ اس بناء پر مذہب کے نام پر چند مراسمِ عبادت سے زیادہ کی گنجائش نہیں ہے۔ خواہ اس کا نام حفاظتِ دین رکھا جائے یا طبیعت خوش کرنے کے لئے اقامتِ دین کا نام دے دیا جائے، نتیجہ ایک ہے، نہ قرونِ وُسطیٰ کا دَور واپس آئے گا اور نہ زمانہ ہماری خاطر رجعتِ قہقری اختیار کرے گا۔

مزید فرمایا کہ :۔" دُنیا اپنی تنظیمات میں رجعتِ قہقری نہ اختیار کرے گی اور زمانہ ہماری خاطر قدیم شکلوں کو قبول نہ کرے گا۔ اگر زندہ رہنا ہے تو لامحالہ احکام کے موقع و محل کی تعیین کر کے اسلام کی روح اور تعلیمات کو جدید تنظیمات میں بھرنا ہو گا۔ !"

پھر فرمایا کہ :" موجودہ دَور میں مسلم ممالک طبقاتی کش مکش کی جس منزل پر پہنچے ہوئے

ہیں۔ اگر مذہبی پلیٹ فارم سے انفرادی ملکیت کی آڑ میں سرمایہ داری و جاگیرداری نظام کی تبلیغ و تائید کی جاتی رہی تو لازمی طور پر وہ اشتراکیت کے دامن میں پناہ لینے پر مجبور ہوں گے؛"

اس عالی پایہ کتاب سے آخری اقتباس دے کر بحث کو ختم کرتا ہوں۔ آپ فرماتے ہیں: "مسلم معاشرہ ایک مرحلہ سے گذر کر دوسرے مرحلہ میں قدم رکھ چکا ہے اور آشیانہ بنانے کے لئے تنکوں کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ یہ سرگردانی اس لئے کہ دوسری دنیا کے آشیانے اس طائرِ لاہوتی کے جسم و روح پر فٹ نہیں آ رہے ہیں اور اس کا اپنا آشیانہ جس دور میں تھا وہ دور ختم ہو چکا ہے۔ اس میں جس دنیا کے تنکے تھے وہ دنیا لٹ چکی ہے۔ قانونِ فطرت کے مطابق کوئی دور اس طرح ختم نہیں ہوتا کہ وہ دوبارہ اپنی شکل میں واپس آئے اور کوئی دنیا اس طرح نہیں لٹتی کہ وہ اپنی سابقہ حالت پر پھر آباد کی جائے۔ یہ عالمِ کون و فساد ہے۔ یہاں بگاڑ کے ساتھ بناؤ، اور تخریب کے ساتھ تعمیر ہے۔ خود فطرت ہر گوشہ میں کانٹ چھانٹ کرتی اور خوب سے خوب تر شئے کو فٹ کرتی ہے۔ جب کوئی شئے ایک جگہ فٹ ہو جاتی ہے تو کمتر شئے کے لئے وہ جگہ نہ چھوڑے گی بلکہ قبضہ کے لئے اس سے بلند تر اور برتر شئے کا ہونا ضروری ہے!"

ان تمام تصریحات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سنّتِ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کوئی جامد شئے نہیں بلکہ ایک البیا زندہ اور متحرک رویّہ ہے جو مسائل کو اخذ کرنے کے لئے اپنا مخصوص منہاج رکھتا ہے۔ یہ منہاج آج بھی ہمارے لئے روشنی کا کام دے سکتا ہے۔ اگر ہم نے عہدِ حاضر کی تازہ ذمّہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا ہے اور صحیح معنوں میں اپنے ملک میں نظامِ مصطفےٰ کا نفاذ عمل میں لانا ہے تو ہمیں اپنی سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ روش ترک کر کے اسلام کی شورائی، اشتراکی، انسان دوستی اور عوام پروری کی اقدار کو اپنانا ہو گا تا کہ ہم اسلام کے عالمگیر انقلابی اور انجذابی پہلوؤں کا حق ادا کر سکیں جیسا کہ علامہ اقبال مرحوم نے کہا ہے ؎

آئینِ نَو سے ڈرنا، طرزِ کہن پہ اڑنا ٭ منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں"

ہندوستان میں بھکتی تحریک

یوسف سلیم چشتی

۱- ہندوؤں نے جن کو آریہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا، ان تمام اقوام کو اپنے اندر جذب کر لیا جنھوں نے ازمنۂ قبل مسیح میں ہندوستان پر حملہ کیا تھا مثلاً سیتھیئن، یونانی، ساکا اور ہُن یہ چاروں حملہ آور قومیں رفتہ رفتہ اپنی شخصیت اور انفرادیت کھو بیٹھیں اور ہندو قوم میں مدغم ہو گئیں۔ یعنی اپنا مذہب اور اپنی تہذیب دونوں سے بیگانہ ہو کر خالص ہندو ہو گئیں۔

۲- آریائی ذہن یا ذہنیت کی ایک خصوصیت احساسِ برتری ہے جو علم یا فلسفے میں ترقی کی وجہ سے ان کے اندر پیدا ہو گیا تھا۔

۳- دوسری خصوصیت تعصب اور تنگ نظری ہے جو احساسِ برتری کا منطقی نتیجہ ہے۔ اس کا ثبوت اس ظالمانہ طرزِ عمل سے مل سکتا ہے جو ہندوؤں نے جینیوں اور بودھوں کے ساتھ روا رکھا۔

ہندوؤں نے ان دونوں سے کہا کہ تم دونوں خدا کو نہیں مانتے، اس بات کو ہم گوارا کر لیں گے۔ لیکن اگر تمھیں اس ملک میں رہنا ہے، یعنی آریہ ورت میں تو ویدوں کو پرمان تسلیم کرنا ہوگا۔ ورنہ ہم تمھیں آریہ ورت میں رہنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ بزورِ شمشیر ملک بدر کر دیں گے۔

(۱) بودھوں نے ویدوں کو حجت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا، نتیجہ یہ نکلا کہ تیسری صدی قبل مسیح میں بودھوں کی سارے ملک پر حکومت تھی۔ ۲۷۳ ق م اشوک اعظم۔ لیکن ساتویں صدی عیسوی میں ایک بودھ بھی آریہ ورت میں باقی نہیں رہا۔ اور آج بھی نہیں ہے، از کاٹھیاواڑ تا آسام اور از ہماچل پردیش تا ٹراونکور۔

۲- بودھوں کو ختم کرنے کے بعد جینیوں کی باری آئی۔ لیکن مغرب اور جنوب میں

ان کی حکومتیں قائم تھیں اس لئے ان کا خاتمہ نہیں ہو سکا۔
گیارھویں صدی عیسوی میں محمود غزنوی کے حملوں نے ہندوؤں کو اس قدر حواس باختہ کر دیا کہ وہ جینیوں کے خلاف متحدہ محاذ قائم نہ کر سکے۔ ادھر جینیوں نے بھی اپنے اندر لچک پیدا کر لی یعنی بت پرستی اور ہندو ثقافت اختیار کر لی۔ اس لئے ان کی تعداد اس وقت ۱۴-۱۵ لاکھ ہے۔ یہ لوگ تہذیب اور تمدن ظاہری رسوم اور طرزِ معاشرت کے لحاظ سے بالکل ہندو ہو گئے ہیں۔ ہندوؤں کے تہوار مناتے ہیں اور ان کے دیوتاؤں کے گن گاتے ہیں۔ مختصر یہ کہ ان کے مندروں اور ہندوؤں کے مندروں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ان کے باقی رہ جانے کی ایک وجہ اور بھی ہے جو اقتصادی ہے۔ یہ فرقہ ہندوستان کی تجارت پر چھایا ہوا ہے۔ میں بھوپال میں دیکھ چکا ہوں۔ حکمراں تو مسلمان تھا مگر حکومت میں اقتدار پانچ فیصد جینیوں کے ہاتھ میں تھا لیکن مسلمانوں نے ہندوستان میں آکر اپنے تشخص ہی کو برقرار نہیں رکھا بلکہ ہندوؤں کو مسلمان بنانا شروع کر دیا اور بلا مبالغہ تاریخ ہند کا یہ عدیم المثال حادثہ ہے۔

۱۲۰۶ء میں ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی لیکن چشتی سلسلے کے سب سے نامور صوفی حضرت خواجہ معین الدین چشتی نے ۱۱۹۰ء سے ہی اجمیر کو اپنی تبلیغی سرگرمیوں کا مرکز بنا لیا تھا۔ ہندوؤں کے پایہ تخت میں ایک مسلمان صوفی کا تن تنہا مستقل قیام کر لینا اور علانیہ تبلیغ کرنا یہ تاریخ عالم کے عجائبات میں سے ہے اور جب تک کسی شخص میں فوق العادت روحانی طاقت نہ ہو وہ ایسی جسارت کا ارتکاب نہیں کر سکتا۔

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ خواجہ صاحب نے اجمیر کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنانے سے پہلے پانچ سال تک ملتان میں رہ کر سنسکرت اور ہندو دھرم سے بخوبی واقفیت حاصل کر لی تھی۔ کیونکہ اس کے بغیر کوئی مبلغ تقابلِ ادیان نہیں کر سکتا۔

مسلمانوں سے پہلے جو قومیں یہاں آئی تھیں وہ مذہب اور مذہبی کتاب

دونوں سے بیگانہ اور محروم تھیں اس لئے ہندوؤں نے انہیں بآسانی اپنے دھرم میں جذب کر لیا۔ لیکن مسلمانوں کے پاس ہندو دھرم سے بہتر اور برتر دھرم تھا اس لئے پانسہ پلٹ گیا اور چشتی سلسلے کے صوفیوں نے ہندوؤں کو مشرف باسلام کرنا شروع کر دیا۔ چونکہ ۱۲۰۶ء شمالی ہند میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہو گئی اس تبلیغ کی راہ میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہی۔

چشتی سلسلے کے صوفیوں نے ہندو دھرم اور ہندوؤں کی مذہبی رسوم اور عبادات کا مطالعہ کیا تو انہیں معلوم ہوا کہ ان کے دھرم میں موسیقی عبادت میں داخل ہے۔ چنانچہ رگ وید نظم میں ہے اور اس کے منتر گا کر پڑھے جاتے ہیں[1] بلکہ بھجن گانا ہی عبادت کی روح ہے۔ باقی پوجا پاٹ تو فروعی رسوم ہیں اور وہ پروہت انجام دیتا ہے۔

اس لئے ہندوؤں کو اپنی طرف مائل (ATTRACT) کرنے کے لئے چشتی صوفیوں نے قوالی کا سلسلہ شروع کیا۔ جب ہندو قوالی سننے کے لئے جمع ہو جاتے تو قوالی کے بعد انہیں اسلام کی تبلیغ کی جاتی تھی۔ یہ طریقہ بہت کامیاب ثابت ہوا۔

پنجاب میں شیخ فرید الدین گنج شکر نے راجپوتوں کے سولہ قبیلوں کو یعنی ہزاروں ہندوؤں کو مسلمان بنا دیا اور ان کے جانشین سلطان المشائخ محبوب الٰہی سلطان نظام الدین اولیاء نے تو سارے ہندوستان میں تبلیغ کا نظام قائم کر دیا۔ ان سے بڑا نیز کامیاب مبلغ اسلام آج تک پیدا نہیں ہوا۔ ان کی زندگی اسلام کی عظمت اور صداقت کا جیتا جاگتا ثبوت تھی۔

(ا) اللہ نے انہیں تبلیغ کے لئے طویل ترین مدت عطا کی یعنی پچپن سال۔ ان کی وفات پچانوے سال کی عمر میں ہوئی۔

(ب) اللہ نے انہیں باطنی علوم کے علاوہ ظاہری علوم سے بھی نوازا تھا صوفی سے پہلے وہ مُلّا نظام الدین تھے اور منطق اور مناظرے میں بے نظیر تھے۔ اسی لئے علماء میں "صف شکن" لقب تھا۔ جب وہ علوم اسلامیہ اور معقولات میں سرآمد روزگار ہو گئے تو دلّی کے سب سے بڑے شیخ حضرت شیخ نجیب الدین المتوکل کے

[1] ہمیں تو دیر میں پرشاد کھانا اور بھجن گانا۔

پاس گئے اور قاضیٔ شہر کے عہدے کے لئے دعا کی التجا کی انہوں نے کہا: "مُلّا نظام! قاضی مشو، چیزے دیگر شو!" انہوں نے کہا وہ کیا؟ انہوں نے کہا: "پاک پٹن چلے جاؤ اور محبوب الٰہی بن جاؤ!" بلکہ جہانگیر عالم بن جاؤ۔ چنانچہ انہوں نے پیادہ پا دلّی سے پاک پٹن کا سفر کیا اور جب بوقتِ ظہر شیخ کی خدمت میں پہنچے تو وہ وضو کر رہے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی باوا صاحب کھڑے ہو گئے اور یہ شعر پڑھا

اے آتشِ فراقت دل ہا کباب کردہ ٭ سیلابِ اشتیاقت جانہا خراب کردہ

یہ شعر سنتے ہی مُلّا نظام الدّین کے دل و دماغ کی دنیا ہی بدل گئی۔ اور بے اختیار شیخ کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ نے مُلّا نظام الدّین کو ہند کے تمام صوفیوں کا سلطان بنا دیا۔ چنانچہ ہندوستان میں ہزاروں صوفی گزرے ہیں مگر سلطان کا لقب ایک ہی صوفی کو حاصل ہوا۔ سلطان جی کی درگاہ سات سو برس گزر جانے کے بعد آج بھی مرجعِ خلائق ہے اور شاہ و گدا، مسلمان اور ہندو دونوں حاضر ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ بھارت کے ہندو صدر ڈاکٹر راجندر پرشاد اور ڈاکٹر رادھا کرشنن دونوں نے حاضری کی سعادت حاصل کی۔

مَیں معافی چاہتا ہوں جذبات کی رَو میں بہہ گیا۔ آمدم برسرِ مطلب! سلطان جی نے پچپن سال تک مسلسل اسلام کی تبلیغ کی۔ سات بادشاہوں کا زمانہ دیکھا لیکن کسی بادشاہ کے دربار میں جانا تو کجا کسی بادشاہ کو اپنی درگاہ میں حاضر ہونے کی اجازت نہیں دی۔ ان کی تبلیغی خدمات کا اندازہ صرف اس ایک بات سے ہو سکتا ہے کہ شمال میں ان کے ایک مرید کا مزار سرینگر میں ہے جس نے تبلیغِ اسلام کی۔ دوسرے کا مزار جنوب میں بیجاپور میں ہے۔ تیسرے کا مزار مشرق میں سلہٹ (آسام) میں ہے۔ چوتھے کا مزار مغرب میں منگرول (کاٹھیاوار) میں سمندر کے کنارے ہے، جہاں میں اکثر جایا کرتا تھا۔

سلطان جی نے اپنے سات سو مریدوں کو مبلّغ بنا کر دکن بھیجا تھا۔ چونکہ ہر مبلّغ پالکی میں سوار ہو کر آیا تھا اس لئے دکن کی تاریخ میں سات سو پالکیوں سے یہی مبلّغین مراد ہیں۔ تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے کہ سلطان جی نے دکن میں سات سو پالکیاں بھیجی تھیں۔

سلطان جی کی وفات ۱۳۲۵ء میں ہوئی، ان کے جانشین چراغ دہلیؒ کی وفات ۱۳۵۶ء میں ہوئی۔ چراغِ دہلیؒ یعنی حضرت خواجہ نصیر الدین اودھیؒ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ جب خبطی سلطان محمدؒ تغلق کی وفات کے بعد اس کی جانشینی کا مسئلہ درپیش ہوا تو اُس وقت حضرت چراغِ دہلی ٹھٹھے میں موجود تھے۔ کیونکہ محمدؒ تغلق انہیں اپنے ساتھ لے گیا تھا اور اس خبطی کو پاجامہ پہنانے کی ڈیوٹی ان کے ذمے تھی۔ اس خبطی سلطان کے بھتیجے نے جس کا نام سلطان فیروز تغلق تھا حضرت سے دعا کی درخواست کی۔ آپ نے فرمایا کہ وعدہ کرو کہ "تم ساری عمر تبلیغ کرو گے!" چنانچہ حضرت کی دعا قبول ہو گئی۔ جب وہ بادشاہ ہوا تو اس نے تبلیغ و اشاعتِ اسلام کیلئے ہندوستان میں پہلا اور آخری تبلیغی کالج قائم کیا۔ اس کی تبلیغ کے لئے 'فرشتہ' کا مطالعہ کافی ہے۔

اس کالج سے ہزاروں مبلغین تیار ہو کر نکلے جنھوں نے ہندوستان میں تبلیغ کی اور لاکھوں ہندوؤں کو مسلمان بنایا۔ افسوس صد افسوس! سلطان فیروز تغلق کے بعد پھر اس ملک میں دوسرا سلطان فیروز پیدا نہ ہو سکا۔ تیسرا سلطان جس نے تبلیغ کی وہ سلطان سکندر بت شکن تھا جو ایک چشتی صوفی کا مرید تھا۔

چوتھا سلطان جس نے تبلیغ کی وہ سلطان سکندر لودھی تھا۔ جس نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ جو ہندو مسلمان ہو جائے اسے میرے پاس روانہ کیا جائے تاکہ میں اسے شاہی مہمان بناؤں اور چلتے وقت بیس بیس تولے کے دو کپڑے اور خلعتِ فاخرہ عطا کروں۔

پانچواں سلطان جس نے تبلیغ کی سلطان محمود بیگڑھا تھا جو حضرت شاہ عالم سہروردی کا مرید تھا۔ ۱۵۱۱ء میں وفات پائی۔

چھٹا اور آخری سلطان جس نے تبلیغ کی وہ سلطان ٹیپو شہید تھا جو ٹیپو مستان میسوریؒ کا مرید تھا۔ ۱۷۹۹ء میں شہادت کا مرتبہ حاصل کیا: ع

"ٹیپو بوجہ دینِ محمدؐ شہید شد!"

—— (تاریخ شہادت "شمشیر گم شد" ۱۲۱۴ھ) اس تفصیل سے مقصود یہ دکھانا ہے کہ جن جن بادشاہوں نے تبلیغ کی وہ سب کسی نہ کسی صوفی شیخ کے مرید تھے یعنی

تبلیغ کا فریضہ صوفیوں اور ان کے معتقدین ہی نے انجام دیا۔ فقہ اور حدیث کے علماء کا اس کارِ خیر میں کوئی حصّہ نہیں ہے۔ چشتیوں کے بعد سہروردی سلسلے کے صوفیوں نے اسلام کی اشاعت میں حصّہ لیا۔

پہلے مبلّغ مخدوم جہانیاں جہانگشت سیّد جلال بخاری ہیں جنھوں نے پنجاب اور سندھ میں اسلام کی تبلیغ کی۔ انہوں نے اپنے فرزند شاہ قطب عالم کو گجرات اور کاٹھیاواڑ میں تبلیغ کی۔ ان کا مزار احمد آباد سے ۵ میل کے فاصلے پر موضع باٹوہ میں واقع ہے۔ ۱۹۴۵ء میں جب چندر یگر کے الیکشن کے سلسلے میں احمد آباد گیا تھا تو مزار پر بھی گیا تھا۔

ان کے بعد ان کے فرزند حضرت شاہ عالم نے گجرات اور کاٹھیاواڑ میں تبلیغ کی۔ سلطان محمود بیگڑھا انہی کا مرید تھا۔ چنانچہ جب وہ احمد آباد میں قیام کرتا تھا تو عصر کی نماز کے بعد جامع مسجد کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر ہندوؤں کو مخاطب کر کے اسلام کی دعوت دیتا تھا۔ گجرات میں تبلیغ کا سہرا حضرت شیخ احمد کھٹو کے سر ہے، جو شاہ عالم سے پہلے ہوئے ہیں۔ شاہ عالم کا مزار احمد آباد سے ۳ میل اور کھٹو کا مزار سات میل کے فاصلے پر تھا مگر اب دونوں مزار شہر میں آگئے ہیں!

بہار اور بنگال میں بھی چشتی سلسلے کے صوفیوں نے تبلیغ کی جن میں شیخ جلال تبریزی سلہٹی، شیخ علاء الحق پنڈوہ اور شیخ شرف الدّین منیری (بہار) کا نام بہت مشہور ہے۔ تمام ہندو مؤرّخین نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ اسلام نے اپنی تعلیمات کی بدولت ہندوؤں کو اپنی طرف کھینچا اور ڈاکٹر تارا چند نے تو اس موضوع پر ایک مستقل کتاب لکھدی جو بڑی مستند اور محققانہ ہے۔ ڈاکٹر کے کے دت "An Advanced History of India"

"Famous muslim saints lived and laboured in India during the med. period and disseminated the ideas of m.phil and mysticism in this land"

Hinduism could not absorb Islam but was in turn, influenced by Islam in two ways.

الحمدللہ! ایک ہندو بھی معترف ہے کہ ہندو دھرم، اسلام کو اپنے اندر جذب نہ کر سکا بلکہ خود متاثر ہوا۔ جب ہندوؤں نے دیکھا کہ ہندو تو جوق در جوق مسلمان ہوتے جا رہے ہیں تو انہوں نے سوچا کہ اگر یہی سیل و منہار رہے تو ایک دن سارے ہندو مسلمان ہو جائیں گے۔ لہٰذا سیلاب کے آگے بند باندھنا لازمی ہے۔ انہوں نے اس تبلیغی سیلاب کے آگے بند باندھا، بس یہی انداز ان کے ذہن وقاد کی زرخیزی (RESOURCEFULESS) کا ثبوت ہے اور یہی میری تقریر کا مرکزی تصوّر ہے۔ جب ہندو علماء نے اسلامی اصول کا مطالعہ کیا تو انہیں معلوم ہوا کہ اسلام کے جو اصول ہندوؤں کے دل و دماغ کو اپیل کرتے ہیں وہ

(۱) توحیدِ ذاتِ باری اور اس کا منطقی نتیجہ اصولِ حرّیت واخوت اور مساوات وغیرہ۔

(۲) فضیلت کا معیار ذات یا قومیت یا نسل یا حسب یا نسب نہیں بلکہ تقویٰ ہے۔

(۳) رسومِ ظاہری قطعًا مقصود نہیں ہیں۔ ع: "درویش صفت باش و کلاہِ تتری دار!" — ہندوؤں نے دیکھا کہ ایک شودر بلکہ چنڈال بھی مسلمان ہوتے ہی مسلمانوں کا بھائی بن جاتا ہے اور مسجد میں بادشاہ اور عالمِ دین کے برابر شانہ بشانہ کھڑا ہو جاتا ہے اور ایک ہی دستر خوان پر کھانا کھا سکتا ہے یعنی یہ قانونِ مساوات ہندوؤں کے لئے سب سے بڑی کشش رکھتا ہے۔ پس انہوں نے اسلام کے سیلاب کے آگے جو بند باندھا اس کا نام ہندوستان کی کلچرل ہسٹری میں بھگتی کی تحریک ہے۔ بھگتی کی تحریک کے اساسی اصول سراسر اسلامی ہیں۔

① توحیدِ ذاتِ باری ② مساواتِ نسلِ انسانی ③ اخوّت اور ④ اللہ سے محبت — تلسی داس نے جو بھگتی تحریک کا بہت بڑا مبلغ ہے۔ اس تحریک کا کلمہ یہ "دوہا" مقرر کیا جس میں اس تحریک کی پوری روح سمودی ہے :ـــ

"جات پات پوچھے نا کوئے ~~~~~~ ہر کو بھجے، سو ہر کا ہوئے!"

ہندوؤں نے ہندوستان کے طول و عرض میں اس تحریک کے مرکز قائم کئے اور غور طلب بات یہ ہے کہ پندرھویں اور سولھویں صدی عیسوی میں بیک وقت سارے ہندوستان میں اس تحریک کے داعی اور مبلغ پیدا ہوگئے جنھوں نے اسلامی سیلاب کے آگے بند باندھ دیا اور ہندوؤں کو مسلمان ہونے سے روک دیا۔ ورنہ آج ہندوستان میں ہندو، اقلیت میں ہوتے۔

مسٹر دت اپنی تاریخ - "An Advanced History of INDIA" - میں لکھتا ہے کہ:

All these reformers were exponents of the Bhakti cult. They preached the fundamental equality of all relig-ions and the unity of Godhood and held that the dignity of man depends upon his actions and not on his birth. They protested against the ritualism and formalities of religion and domination of the priests and emphasised simple devotion and faith as the means of salvation for one and all. P. 403-404

گویا ان ہندو مصلحین نے ہندو دھرم کی بنیادوں کو منہدم کر دیا کیونکہ ہندو دھرم تو ذات پات کے امتیاز پر قائم ہوا ہے۔ (تفصیل کے لئے دیکھو منوسمرتی)

اب میں بھکتی تحریک کے چند مشہور مبلغین اور ہندو مصلحین کا مختصر تذکرہ کروں گا۔ (۱) بھکتی تحریک کا بانی راما نند ہے جو چودھویں صدی عیسوی کے آخر میں الٰہ آباد میں برہمن خاندان میں پیدا ہوا تھا۔ اس نے ساری عمر بھکتی کا پیغام

سنایا اور ذات پات کے خلاف لسانی جہاد کیا۔ چنانچہ اس کے بارہ مشہور شاگردوں میں ایک نائی تھا دوسرا موچی تھا تیسرا جولاہا تھا، جن کو ہندو بہت ذلیل سمجھتے ہیں ——!!

(۲) ولبھ اچاریہ ۱۴۷۹/۱۵۳۴ء میں بنارس میں پیدا ہوا تھا۔ وہ بنیادی طور پر ایک فلسفی تھا اور خالص وحدۃ الوجود (شدّھ ادَویت) کے مدرسۂ فکر کا بانی تھا مگر وہ ایک مذہبی مصلح بھی تھا یعنی بھکتی تحریک کا علمبردار تھا۔

(۳) کبیر بنارس میں پیدا (۱۴۴۰/۱۵۱۸ء) ہوا اور توحید ایزدی اور مساوات انسانی کا درس دیا۔ "مچھلی کو لاکھ بار گنگا کے پانی سے دھو، بو نہیں جائے گی اور کوّا لاکھ بار گنگا میں نہائے، سفید نہیں ہوگا!"

(۴) سورداس۔ سولھویں صدی۔ آگرہ — انہوں نے اپنے دوھوں میں توحید ایزدی اور مساواتِ انسانی کا پیغام دیا۔ سورداس پیدائشی نابینا بھی تھے اور پیدائشی ولی بھی تھے۔

(۵) چیتن نے ۱۴۸۵/۱۵۳۴ء بنگال میں بھکتی کا درس دیا بلکہ اس تحریک کا سب سے بڑا مبلغ تھا۔

(۶) نانک پنجاب ۱۴۶۹/۱۵۳۲ء

وہی توحید اور مساوات کا درس دیا۔

نانک اس سنسار میں دکھ سکھ سب کچھ ہوئے ÷ گیانی کاٹے گیان سے اور مورکھ بیٹھا روئے

(۷) تلسی داس۔ ضلع باندہ کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے (۱۶۲۳/۱۵۳۲ء) میں ۱۹۴۵ء میں ان کی سمادھی پر گیا تھا۔ ان کی تبدیلی کا واقعہ بہت عبرت انگیز ہے یہ بہت بڑے شاعر تھے اور اپنی بیوی سے بہت محبت کرتے تھے۔ ایک دفعہ ان کی بیوی میکے گئی یہ ضبط نہ کر سکے اسی دن اس کے پاس پہنچ گئے۔ اس نے کہا ہے سوامی! پریم میں اتنے مورکھ ہو گئے! تمھیں بالکل لاج نہیں آئی۔ افسوس! اگر تم رام سے اتنی محبت کرو جتنی مجھ سے تو مہاتما ہو جاؤ۔ یہ سن کر تلسی داس نے بیوی کے کہنے پر عمل کیا۔ ہمیشہ کے لئے بیوی بچوں سے قطع تعلق کر کے رام کو اپنا محبوب بنا لیا اور رامائن لکھ کر رام اور اپنے آپ دونوں کو زندۂ جاوید کر دیا۔ تلسی داس کی رامائن گویا ہندوؤں

کی بائبل ہے ــــ دوہا ــــ

ملسی من ملنے نہیں جب تک خطا نہ پائے ÷ جیسے ودھوا استھری گربھ ہے چھپائے

رامائن تصوّف اور بھکتی کی تعلیمات سے معمور ہے۔ افسوس تفصیل کا موقع نہیں ہے۔

(۸) شنکر دیو وسطی ہند ۱۵۶۸-۱۴۴۹ ــــ سارے وسطی ہند میں بھکتی کا پرچار کیا۔

(۹) میرا بائی ۱۶۱۰-۱۵۵۰ ــــ راجپوتانے کی ریاست میواڑ کی مہارانی کرشن کی محبت میں سرشار تھی اور بھکتی تحریک کی بہت بڑی علمبردار تھی۔ محلّوں میں رہنا چھوڑ دیا تھا۔ گاؤں میں غریبوں میں رہتی تھی۔

(۱۰) سنت تکارام نے ۱۶۴۹-۱۵۹۸ ــــ جنوبی ہند میں بھکتی یعنی کرشن کی محبت کا پیغام سنایا اور ذات پات کے امتیاز کو مٹایا۔

(۱۱) دادو دیال۔ ۱۶۰۳-۱۵۴۴ ــــ انہوں نے گجرات میں بھکتی کا پیغام گھر گھر پہنچایا اور سنایا۔

(۱۲) نام دیو۔ سولھویں صدی میں تھے۔ انہوں نے یو پی راجپوتانہ اور وسطی ہند میں بھکتی کا درس دیا اور ذات پات کے خلاف جہاد کیا۔

<u>آخری بات</u> | ہندوؤں نے اسلام کا مطالعہ کر کے توحید، اخوت، مساوات اور دوسرے اصول اپنی بھکتی کی تحریک میں شامل کر لئے اور اس طرح تبلیغ کے سیلاب کے آگے بند باندھ دیا۔ لیکن مسلمانوں نے یعنی علماء نے COUNTER-ATTACK نہیں کیا۔ یعنی انہوں نے ہندو دھرم کا مطالعہ کر کے اس کی کمزوریاں ہندوؤں پر واضح نہیں کیں۔

تیمور کے حملے کے بعد ایسے حالات رو نما ہو گئے کہ صوفیوں کا قائم کردہ تبلیغی نظام معطّل ہو گیا۔ ہندی علماء میں تبلیغ کا جذبہ پیدا ہی نہ ہو سکا۔ انہوں نے خاندانِ غلاماں سے لے کر عہدِ عالمگیر تک تبلیغ کی طرف توجّہ ہی نہیں کی۔ جس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے ۱۲۰۶ء سے لے کر ۱۷۴۰ء تک قرآن کا ہندی میں تو کجا فارسی میں بھی ترجمہ نہیں کیا۔ یہ کام شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی نے ۱۷۴۵ء میں انجام دیا۔ علماء کی نظر میں یہ ترجمہ بہت بڑا جرم تھا: چنانچہ

ان کے قتل کی سازش کی گئی۔ مسجد فتح پوری کے صدر دروازے میں ان کو قتل کرنے کے لئے ایک سرحدی پٹھان کو آمادہ کیا گیا مگر شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ اسے حملہ کرنے کی ہمت نہ ہو سکی۔ اُردو ترجمہ پورے چھ سو سال کے بعد شاہ عبدالقادرؒ نے ۱۸۰۶ء میں شائع کیا، اور ہندی ترجمہ سات سو سال کے بعد خواجہ حسن نظامی نے ۱۹۲۶ء میں شائع کیا۔ میں نے اس ترجمے پر نظر ثانی کی تھی۔

بہرحال علماء کی اس مجرمانہ غفلت کا نتیجہ یہ نکلا کہ بھکتی کی تحریک کامیاب ہو گئی۔ نیز دیگر مذاہب کا مطالعہ نہ کرنے دوسرا نتیجہ یہ نکلا کہ جب ۱۵۸۶ء میں اکبر کے حکم سے پادریوں نے اسلام پر اعتراضات کئے تو علماء ان کا جواب نہ دے سکے اور نہ جوابی حملہ کر سکے۔ کیونکہ علماء نے انجیل اور توراۃ کا مطالعہ بالکل نہیں کیا تھا۔

چنانچہ اکبر، علماء اور اسلام دونوں سے بدظن ہو گیا اور اس نے پادریوں کو آگرے میں گرجا تعمیر کرنے کی اجازت بھی دے دی اور ہندوستان میں تبلیغ کی اجازت بھی دے دی۔ ہند میں پہلا گرجا ۱۵۸۸ء میں تعمیر ہوا۔ اس کے بعد ۱۶۰۲ء میں دوسرا وفد آیا۔ اس وقت اکبر لاہور میں تھا۔ اس نے لاہور میں دوسرا گرجا تعمیر کرنے کی اجازت دی۔ چنانچہ یہ گرجا ۱۵۹۴ء میں تعمیر ہوا تھا۔ جہانگیر کے عہد میں ایک عیسائی JESUIT / پادری نے فارسی زبان میں اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ایک ضخیم کتاب لکھی اور ۱۶۱۲ء میں آگرے میں جہانگیر کی خدمت میں پیش کی۔ لیکن علماء اس کا جواب بھی نہ لکھ سکے کیونکہ تقابلِ ادیان کا SUBJECT ان کے نصابِ تعلیم ہی سے یکقلم خارج تھا اور آج بھی خارج ہے۔ فارسی تاریخوں میں اِن مناظروں کی تفصیل نہیں ملتی (کیونکہ علماء کو شکست ہوئی تھی!) مگر پرتگالی JESUIT پادریوں نے اس موضوع پر کئی کتابیں لکھیں جو میری نظر سے گزر چکی ہیں۔

خلاصۂ کلام اینکہ ہندو کے زرخیز دماغ نے عین وقت پر تبلیغ کے سیلاب کے آگے بند باندھ دیا اور اپنی قوم کو مسلمان ہونے سے بچا لیا۔ علماء میں چونکہ ذوقِ تبلیغ سرے سے موجود نہ تھا اس لئے انہوں نے کوئی جوابی کارروائی نہیں کی

اور اس کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ "عیاں را چہ بیاں!" — اگر علماء وید، منو سمرتی، دھرم شاستر اور نیتی شاستر اور پرانوں کا معاملہ کرتے تو ان ہندو ریفارمروں سے کہہ سکتے تھے کہ: (۱) ویدوں میں توحید تو کجا؟ خدا کا ذاتی نام تک مذکور نہیں ہے[۱]۔ سارے رگ وید میں صرف ایک منتر ہے: "ایکم ستّ ویپرا بہودا ودنتی" لیکن یہاں ستّ سے مراد خدا نہیں بلکہ سچائی ہے یعنی صداقت تو ایک ہی ہے مگر علماء نے اس کی تعبیر میں اختلاف کیا ہے۔ اس سے توحیدِ ذات باری ثابت نہیں ہو سکتی۔ اس کے مقابلے میں رگ وید میں صاف لکھا ہے کہ کائنات میں ۳۳ دیوتا ہیں، ۱۱ زمین میں، ۱۱ فضا میں اور گیارہ آسمان میں۔ اس کے علاوہ رگ وید میں صاف لفظوں میں آفتاب پرستی کی تعلیم دی گئی ہے۔ چنانچہ گائتری منتر کا وہی درجہ ہے جو قرآن میں آیۃ الکرسی کا — پانی میں کھڑے ہو کر آفتاب کی طرف منہ کر کے اس کا جاپ (ورد) انسان میں غیر معمولی قوّت پیدا کر دیتا ہے۔ کسی ہندو کے مرتے وقت برہمن اس کے سرہانے اسی منتر کا جاپ کرتا ہے:

"اوم بھو، بھوا، سواہ، تت سوِیتر ورے نیم بھرگو دیوسیّا دھی مہی دھیو یو نہا پرچودیات!"

(اے آفتاب! ہماری عقل کو صحیح راستے (صراطِ مستقیم) پر چلا، تو سب خوبیوں کا مالک ہے!)

(۲) ہندو دھرم میں نہ حرّیت ہے نہ اخوّت ہے نہ مساوات کیونکہ اس کی بنیاد تو ذات پات پر ہے۔ برہمن، بقول منو مہاراج، برہم کے منہ سے اور شودر اس کے پاؤں سے پیدا ہوا ہے۔ مساوات کہاں؟

(۳) جب مساوات نہیں تو اخوّت عقلاً محال ہے۔

(۴) حرّیت بھی محال ہے کیونکہ ہر شخص تناسخ کے قانون میں محبوس ہے کیسی آزادی اور کہاں کی آزادی؟ فعل پیدائش ہی سابقہ گناہوں کا نتیجہ ہے! مگر مسلمان علماء کو تکفیر باہمی کے دلچسپ مشغلے سے فرصت ہی نہ مل سکی کہ وہ تقابلِ

---

[۱] ۱۹۲۵ء میں غازی محمود دھرم پال مرحوم نے لاہور کے مشہور مناظرے میں آریہ سماجی مناظر دھرم بھکشو سے یہی مطالبہ کر کے اسے سرِ محفل رسوا کر دیا تھا۔

ادیان یا تبلیغ کی طرف متوجہ ہوتے۔ اس کے علاوہ بنیادی وجہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان علماء میں تبلیغ و اشاعتِ اسلام کا ذوق یا جذبہ سرے سے پیدا ہی نہ ہو سکا۔ اس مختصر مقالے میں اور اس محدود وقت میں اس مجرمانہ غفلت کے اسباب و علل پہ بحث نہیں ہو سکتی۔ بس اس قدر واضح ہے کہ ۱۲۰۶ھ سے ۱۹۴۶ء تک سارے ہندوستان میں تبلیغ و اشاعتِ اسلام کے لئے کوئی منظم کوشش نہیں کی گئی۔ اور کوئی مستقل جماعت قائم نہیں کی گئی۔ ۲۴-۱۹۲۲ء میں شدھی تحریک نے مسلمانوں میں عارضی حرکت پیدا کر دی تھی۔ لیکن میں نے اپنی آنکھوں سے دیوبندی اور بریلوی علماء کو برسرِ پیکار دیکھا۔ کیونکہ ۱۹۲۳ء میں مجھے بھی مولانا آزاد سبحانی کانپوری کے ساتھ آگرہ اور پھر تپور جانے اور دونوں جماعتوں کے مولویوں کو ہندوؤں کے بجائے آپس ہی میں مناظرہ کرتے دیکھا تھا۔

۱۹۴۷ء کے بعد سے تو ہم خود ہی دین سے بیگانہ ہو چکے ہیں لہٰذا دوسرے کو تبلیغ کرنے کا خیال ہی ہمارے دماغوں میں نہیں آسکتا ؎

کرتے ہیں شب و روز مسلمانوں کی تکفیر ٭ بیٹھے ہوئے کچھ ہم بھی تو بیکار نہیں ہیں!

مسلمان علماء کی غفلت کے مقابلے میں عیسائی پادریوں اور عیسائی حکومت دونوں کی ہوشیاری دیکھئے۔ انگریزوں نے ۱۷۷۲ء میں اپنی حکومت کا اعلان کیا اور W. HASTINGS بنگال کا پہلا برطانوی گورنر مقرر ہوا۔ عیسائی حکومت کے زیرِ سرپرستی و اعانت صرف بیس سال کے بعد پادریوں نے N.T. انجیل کا بنگلہ زبان میں ترجمہ شائع کر دیا اور اس کا سہرا REV. WALLIAM CAREY کے سر ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر مارشمین اور ڈاکٹر ڈف نے ۱۸۳۶ء میں پوری بائبل کا ترجمہ بنگلہ میں شائع کر دیا۔

۱۸۰۶ء میں پادری ہنری مارٹن نے انجیل یعنی N.T. کا ترجمہ فارسی میں شائع کر دیا کیونکہ فارسی دفتری اور علمی زبان تھی۔ ۱۸۲۸ء میں Dan ISH MISSION نے سیرامپور بنگال میں پہلا تبلیغی کالج قائم کیا۔ آج ہندوستان میں عیسائیوں کے چالیس سے زائد مدارس الٰہیات ہیں۔ صرف پاکستان میں ان کے چار تبلیغی کالج ہیں۔ اللہ کے فضل سے ہمارا ایک کالج بھی نہیں ہے۔ مٹھی بھر

اسلام کا روحانی نظام

جناب خلیق احمد
(ایڈیٹر یقین انٹرنیشنل)

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝
نَحْمَدُہٗ وَ نُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ ۝ ۔۔۔۔ اَمَّا بَعْد

جناب صدر و سامعینِ گرامی قدر! السّلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ۔ یہ احقر اپنے مولائے حقیقی رب العالمین جلّ شانہٗ کی بارگاہ میں سراپا سپاس گزار اور تشکر گذار ہے کہ بندہ کو اس عالی مرتبت اور عظیم المقصد "قرآن کانفرنس" میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی۔ اس کا ذریعہ محترم جناب ڈاکٹر اسرار احمد مدّظلہ العالی کی پُر شفقت دعوت اور دار التصنیف لمیٹڈ مجاہد آباد۔ کراچی یعنی وہ ادارہ جس سے بندہ سالہا سال سے وابستہ ہے بحیثیت مُدیر پندرہ روزہ عربی انگریزی جریدہ "یقین" انٹرنیشنل کی اجازت اور اعانت ہے۔ بندہ ڈاکٹر صاحب موصوف اور اپنے ادارہ کا تہِ دل سے ممنونِ احسان ہے۔

اس بابرکت "قرآن کانفرنس" کے مقاصد اور مختلف النّوع تقاریر اور مقالہ جات کے پیشِ نظر جو اَب تک پیش کئے جا چکے ہیں، بندہ بھی چند گذارشات بہ عنوان "اسلام کا روحانی نظام یعنی تعلیماتِ قرآن مجید اور علم و عمل میں ہم آہنگی!" پیش کرنے کا شرف حاصل کرنا چاہتا ہے فھو المستعان۔۔!!

اوّلاً یہ کہ مرکزی انجمن خدّام القرآن کے زیرِ اہتمام "قرآن کانفرنس" کا انعقاد اور اس کے ضمن میں خطاب خاص و عام کا انتظام، عامّۃ المسلمین کی ضرورت اور مصلحت کے عین مطابق ہے یہ ایک مستحسن اقدام ہے جس کے طفیل قرآن مجید کی تعلیمات اس کے عجائبات رموز و نکات اور اعجاز کے متعلق مضامین عام فہم

اور دل نشین انداز میں علماء و فضلاء کی زبانی دور اور نزدیک پہنچائے جاتے ہیں اور اس کتاب مقدس، کلام الٰہی سے آگاہی ہی نہیں بلکہ محبت و اطاعت کے جذبات کی افزائش کا ذریعہ اور سبب بنتے ہیں، اللّٰھم زد فزد!

ثانیاً میدانِ عمل کی طرف گامزن ہونے کے لئے مسلمانوں کو طیار کرنے اور مستعد بنانے کے سلسلہ میں چند معروضات پیش کرنے کی جسارت کرتا ہوں۔ وھو ھذا۔

قرآن مجید کی سورۃ ۳ یعنی آلِ عمران کی آیت شریفہ ۱۶۴ کے کلمات کی طرف توجہ مبذول کراتا ہوں جو یہ ہیں: لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ إِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ أَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝

یعنی اللہ تعالیٰ جلّ شانہٗ نے اہل ایمان پر بڑا احسان فرمایا کہ انہیں میں سے اس نے ایک رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) بھیجا جو ان پر اُس کی آیات تلاوت کرتا ہے اور انہیں پاک کرتا ہے اور اس کی کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور وہ سب پہلے کھلی گمراہی میں مبتلا تھے۔

بالکل یہی مضمون قدرے لفظی تبدیلی سے سورہ ۲ البقرہ کی آیت شریفہ ۱۵۱ میں اور بصورت دعائے خلیل اللہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام اسی سورۃ کی آیت شریفہ ۱۲۹ میں وارد ہوا ہے اور پھر یہی مضمون سورۃ ۶۲ الجمعہ کی آیت شریفہ ۲ میں آیا ہے۔

ان آیاتِ مقدسہ مذکورہ بالا میں جناب رسالت مآب حضور پُر نور رسول مقبول نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی بعثت کا مقصد بتایا گیا ہے۔ یا یوں کہیئے کہ آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرائض منصبی کا ذکر فرمایا ہے۔

ان فرائض میں سے اوّل فرض آیاتِ الٰہی کی تلاوت کرنا یعنی اللہ تعالیٰ جلّ شانہٗ کے احکام کو سنانا، پہنچانا اور سمجھا دینا۔ دوم لوگوں کے نفوس کا تزکیہ کرنا اور سوم کتاب و حکمت کی تعلیم دینا۔

فی الوقت احقر کے پیش نظر ان سب فرائض کی تشریح نہیں بلکہ صرف

ایک جزو پہ مختصر سی گفتگو کرنا ہے اور وہ ہے تزکیۂ نفس۔ حضرات یہ حقیقت آپ سب پر واضح ہے کہ اسلام ایک ایسا جامع نظامِ زندگی ہے جو دُنیا اور آخرت پر محیط ہے اور پوری بنی نوعِ انسانی سے اس کا تعلّق ہے اور زندگی کے تمام شعبوں کا احاطہ کرتا ہے۔ اقتصادی، اخلاقی، معاشرتی، معاشی، معیشتی، اقتصادی، تعلیمی، عسکری، سیاسی، تجارتی غرض دنیوی اور اُخروی نظامات سب کے سب اسلامی نظامِ حیات میں داخل ہیں اور اُس کے جُزوِ لاینفک ہیں۔ تزکیہ کا نظام بھی اس کا جزو ہے، اور اس قدر اہم جزو ہے کہ ایک مقام کے سوا تمام مقامات پر اسے کتاب و حکمت کی تعلیم پر مقدم رکھا گیا ہے۔ یعنی یُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ پر — یُزَکِّیْھِمْ کو مقدّم رکھا گیا ہے۔ کیونکہ تزکیہ کے بعد ہی کتاب و حکمت سے صحیح طور پر استفادہ ہو سکتا ہے۔

تزکیہ کے معنی ہیں پاکیزگی اور بالیدگی پیدا کرنا یعنی افکار و گفتار اور کردار میں پاکیزگی پیدا ہو اور روح میں بالیدگی آئے، اِسی کو روحانی نظام کہتے ہیں۔

ہمارے معاشرے میں اسلامی لٹریچر کے نام سے ہزاروں کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ وہ سب مفید ہیں اور ان میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ ان میں اسلامی نظام کی الگ الگ تفصیلات بیان کی جاتی ہیں۔ اسلام کا تصوّرِ تعلیم یہ ہے، اس کا معاشی نظام یہ ہے، اس کا عسکری نظام یہ ہے، اس کے سیاسی نظام کی شکل یہ ہے، اس کا معاشی نظام یہ ہے وغیرہ وغیرہ۔ ان مباحث کی افادی حیثیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ہمیں جو تشنگی محسوس ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اسلامی لٹریچر میں نظامِ تزکیہ کا ذکر شاذ و نادر ہی نظر آتا ہے۔ اگر کہیں ہے بھی تو مختصر سا، اور ایک گوشے میں، گویا کہ برائے وزنِ بیت۔ سوال یہ ہے کہ آخر بعثتِ نبوی صلّی اللہ علیہ وسلّم میں ایک اہم ترین مقصد تزکیہ ہی ہے تو اس نظامِ تزکیہ یا نظامِ روحانی کی تفصیلات ہمارے اسلامی لٹریچر میں اسی شدّ و مدّ — شغف اور انہماک کے ساتھ کیوں نہیں؟ — ہماری سوسائٹی میں تعلیمی ادارے ہیں، فوجی اور عسکری ادارے ہیں، طبّی اور معالجاتی ادارے ہیں، انتخابی و انتظامی ادارے ہیں، قانونی ادارے، تجارتی ادارے، سیاسی ادارے اور اسی طرح

کے بہت سے ادارے ہیں جن کی سرپرستی یا مالی اور اخلاقی امداد کی جاتی ہے۔ یہ بتائیے کہ روحانی نظام اور تزکیۂ نفوس کے لئے کتنے ادارے ہیں جہاں روحانی تربیت کا انتظام ہو۔ جن سے عوام اور عوام کے نمائندے دلچسپی لیتے ہوں۔

یہ تشنگی جو آج ہمیں محسوس ہو رہی ہے کوئی نئی تشنگی نہیں۔ اسی تشنگی کو محسوس کرتے ہوئے بعض خاصانِ خدا نے (رحمھم اللہ) روحانی تربیت کے ادارے قائم کئے۔ جن کو تکیہ، حلقہ، یا دائرہ یا خانقاہ کا نام دیا گیا۔ یہ روحانی مراکز نیک نیتی سے قائم کئے گئے اور یہاں تزکیۂ نفس کے طریقے سکھائے جاتے تھے۔ ریاضت، اور نفس کشی سکھائی جاتی تھی۔ اخلاقی تربیت کے ذریعے رُوحانی پاکیزگی اور باطنی بالیدگی پیدا کی جاتی تھی، اُن روحانی بیماریوں کا علاج کیا جاتا تھا جو دنیا میں فتنہ و فساد پھیلاتی ہیں۔ وہ کون سی روحانی بیماریاں ہیں؟ وہ ہیں ہوسِ زن و زر، ہوسِ اقتدار، بغض، حسد، کینہ، بدگمانی، مایوسی، لعلّی ذات اور تحقیرِ غیر، خوف، غفلت، احساسِ کمتری، احساسِ برتری، جذبۂ انتقام، اور اسی قسم کے تمام دیگر قلبی اور باطنی امراض — جو کسی قانون کی گرفت میں نہیں آتے، اور کسی سیاسی طاقت کے دباؤ کو تسلیم نہیں کرتے اور دفع نہیں کئے جا سکتے حالانکہ یہی وہ سب علل اور امراض ہیں جو اخلاقی زندگی کو گھن کی طرح کھا جاتے ہیں اور فساد کے سارے دروازے کھول دیتے ہیں۔ درویشوں کے روحانی مراکز میں انہیں امراض کا علاج کیا جاتا تھا اور اس کے ساتھ اُن میں مثبت قسم کی روحانی بالیدگی و پاکیزگی پیدا کی جاتی تھی۔ ان میں بے نفسی، بے غرضی، اخلاص تواضع، انکسار، جذبۂ خدمتِ خلق، معاملات کی صفائی، بلند کرداری، عالی نظری ایثار اور بے ریا قربانی، کسبِ حلال، صدقِ مقال، رضاجوئی اور اس طرح سے اخلاقی اور روحانی قدریں پیدا کی جاتی تھیں۔ پھر وہ حاکم بھی ہوتے تھے، صاحبِ ثروت بھی ہوتے تھے، قاضی بھی ہوتے تھے، اور تاجر بھی۔ وہ سب کچھ ہوتے تھے۔ لیکن ہر مرحلے پہ فقر اور درویشی ہی اُن کا طُرّۂ امتیاز ہوتا تھا۔ شب کو محرابِ عبادت میں روتے اور دن میں میدانِ جہاد میں رزم آرا ہوتے یا بازار میں آمد و رفت رکھتے یا کرسیٔ عدالت پہ جلوہ افروز ہوتے۔ اُن کی خلوت و جلوت

ایک ہوتی، ظاہر و باطن ایک ہوتا، افکار و گفتار اور کردار ہم آہنگ ہوتے، دُنیا اُن کا مقصد نہ ہوتی بلکہ حصولِ آخرت کا ایک ذریعہ ہوتی۔ یہ بالکل درست ہے کہ اسلامی نظام کے سارے شعبے ایک دوسرے سے اسی طرح مربوط ہیں، جس طرح گھڑی کے پرزے ایک دوسرے سے مربوط ہوتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا تزکیہ کا مردِ کریم اسلامی مشین کا بنیادی پرزہ نہیں؟ اگر ہے اور لاریب ہے اور بعثتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا بنیادی مقصد بھی ہے تو اس نظام کے قائم کرنے کی طرف سے ہم اتنے بے نیاز کیوں ہیں؟ قانونی یا حکومت کے دباؤ سے کبھی اخلاقی اصلاح نہیں ہوتی لیکن روحانی تربیت کے اثر سے بے شمار درندہ صفت افراد اعلیٰ انسان بن گئے، راہزن محافظ بن گئے، میخوار تہجد گذار ہوگئے گویا بقول اکبر الٰہ آبادی مرحوم ؎

مجھے نہ جو خود راہ پر دنیا کے ہادی بن گئے ؛ کیا نظر تھی جس نے مُردوں کو مسیحا کر دیا

انہی روحانی مربّیوں کے بارے میں علّامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے ؎

نہ تاج و تخت میں نے لشکر و سپاہ میں ہے ؛ جو بات مردِ قلندر کی بارگاہ میں ہے!

● ایک اور جگہ فرماتے ہیں ؎

نہ پوچھ اِن خرقہ پوشوں کی عقیدت ہو تو دیکھ ان کو
ید بیضا لئے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں ——!!

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ روحانیت کے نام سے بے شمار قسم کے پیشہ ور لوگوں نے دکانیں کھول رکھی ہیں۔ دُنیا کماتے ہیں اور دوسروں کا ایمان برباد کرتے ہیں۔ لیکن یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ نقالی اس چیز کی ہوتی ہے جس کی جاندار حقیقت ہوتی ہے۔ بے جان اور بے حقیقت شے کی نقالی نہیں کی جاتی۔ روحانی تزکیہ کرنے والے خاصانِ خدا ہر جگہ اور ہر دور میں ہوتے ہیں مگر اُن کی شناخت مشکل ہوتی ہے۔ مولائے کریم سے توفیق مانگتے رہنا چاہیئے کہ وہ ہمیں اصل و نقل میں تمیز کرنے والی آنکھیں عطا فرمائے۔

حضرات! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تین مقاصدِ بعثت کا ذکر تو حتی المقدور پیش کر سکا یعنی تلاوتِ آیات، تزکیۂ نفس اور تعلیم کتاب وحکمت

ہم دیکھتے ہیں کہ تلاوتِ آیات اور تعلیم کتاب و حکمت، دونوں کا سلسلہ عہدِ نبوی صلّی اللہ علیہ وسلّم سے آج تک جاری ہے۔ تو کیا یہ بات عقل قبول کر سکتی ہے کہ روحانی تزکیہ کا سلسلہ ضعیف و ناتواں رہا ہو؟ درانحالیکہ اس کے بغیر تلاوتِ آیات اور تعلیم کتاب و حکمت دونوں بے جان، بے روح اور بے ثمر ہیں۔ اس لیے ہمیں اپنی تلاش جاری رکھنا چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ کے نیک بندے صالح بندے اور روحانی مصلحین ہمیشہ کی طرح آج بھی موجود ہیں۔ آئیے تلاش کیجئے کہ آپ کا حصّہ کہاں ہے؟ دیکھئے کس میں اتّباعِ شریعتِ محمّدیہ علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام کے ساتھ ساتھ درویشانہ روحانی اوصاف موجود ہیں۔ سرِدست صرف دو باتیں دیکھئے، اُن میں مال کی محبّت تو نہیں؟ اُن میں اقتدار کی ہوس تو نہیں؟ قرونِ اُولیٰ، اصحابِ صُفّہ اور تمام سلسلہ ہائے قدیم و جدید کا ذکر تو تحصیلِ حاصل ہوگا۔ ہم اپنے ماضی قریب کی نامور ہستیوں کے کارناموں کے لیے مرہونِ منّت ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدّث دہلویؒ اور اُن کا خانوادہ، حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکّی رح اور اُن کی خانقاہ کے تربیت یافتہ نفوسِ قدسی نے اسلام اور اُمّتِ مسلمہ کی کیا گراں قدر خدمات سرانجام دی ہیں؟ اُن کے ذکرِ خیر سے ہمارا ایمان تازہ، یقین مستحکم اور عقیدہ راسخ ہوتا ہے۔ اسی سلسلہ کی خدمات کی تقویم و تائید کے لیے ہمارے حضرت مولٰینا طفیل احمد صاحب فاروقی قادری مجددی رحؒ نے اپنی حیات بابرکات میں ایک جامع الفیوض تعلیمی ادارہ بنام مدرسہ تعلیم الاسلام تبلیغی کالج کی بنیاد رکھی بفضلہ تعالیٰ ولعونہٖ جس کے ذریعہ دینی اور دُنیوی تعلیم کو یک جا کر کے سلسلۂ درس و تدریس جاری رکھا۔ حضرت والاؒ نے خانقاہ غفوریہ رحیمیہ بھی قائم کی جس کے ذریعہ روحانی تزکیہ کا نظام قائم کیا، جو ماشاء اللہ آب و تاب سے جاری ہے۔ تبلیغ دین کی دیگر مساعی جمیلہ کے علاوہ تصنیف و تالیف کے ذریعے بالعموم اور پندرہ روزہ عربی انگریزی جریدے "یقین" انٹرنیشنل جو گذشتہ ۲۸ سال سے باقاعدہ شائع ہو رہا ہے، کے ذریعے بالخصوص اسلام کے پیغام کو بہترین الفاظ اور محبّت آفریں انداز میں دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچانے کا انتظام فرمایا۔ اس نیازمند حضرت کی زبان حقیقت بیان سے یہ الفاظ

سُنتے اور دل پر نقش کر لئے۔ وہ فرماتے تھے کہ: "ہمارا مدرسہ دن کا مدرسہ ہے اور رات کی خانقاہ!"

میری آج کی گفتگو کا لُبِّ لُباب اور ماحصل یہ ہے کہ تعلیم دین کے ساتھ ساتھ تزکیۂ نفس کا اہتمام اور انتظام از بس ضروری، لازمی اور لابدی ہے:۔

والسلام علیٰ من اتبع الھُدیٰ۔

(بقیہ ص ۱۲۶)

لاہوری احمدیوں نے بھی اپنے مرکز دارالسلام میں ایک تبلیغی کالج قائم کر دیا ہے ۱۸۴۰ء میں مرزاپور سے پوری بائبل کا اردو میں ترجمہ شائع ہو گیا۔ اب تک سات سو زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ ہم نے ویدوں کا ترجمہ آج تک نہیں کیا۔ ہمارے علماء سنسکرت پڑھنا حرام سمجھتے ہیں لیکن H. H. WILSON نے رگ وید کا ترجمہ ۱۸۶۵ء میں چھ جلدوں میں شائع کر دیا اور اس کے جانشینوں نے باقی ماندہ تین ویدوں کا ترجمہ کر دیا۔ بھگوت گیتا کا اوّلین ترجمہ سر ولیم جونز نے ۱۷۸۵ء میں کلکتہ سے شائع کیا تھا۔ آج ایک درجن سے زائد ترجمے مل سکتے ہیں۔ پادریوں نے ہندوؤں، جینیوں، اور بودھوں کی ساری مذہبی اور فلسفیانہ کتب کا جرمن اور انگریزی میں ترجمہ کر دیا ہے۔ تفصیل سے اجتناب کرتا ہوں کیونکہ آپ کو ان کتابوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

پادریوں نے تمام اپنشدوں کا انگریزی، جرمن اور فرنچ میں ترجمہ کر دیا ہے۔ اپنشد ۱۰۸ ہیں۔ ان میں سے ۱۳ بہت مشہور ہیں۔ ڈاکٹر سیوم نے ان ۱۳ اپنشدوں کا انگریزی میں ترجمہ کر دیا ہے۔ یورپ اور امریکہ کی ہر یونیورسٹی میں سنسکرت کا شعبہ قائم ہے۔ ہم نے چھ سو سال حکومت کی لیکن سنسکرت کا ایک عالم پیدا نہیں کیا۔ ؎

"یوسف خدا کے واسطے کر قصہ مختصر ؛ اپنی تو نیند اڑ گئی تیرے فسانے میں!"

اقبال کا پیغام

پروفیسر یوسف سلیم چشتی

۱- یہ سچ ہے کہ اقبال شاعر بھی ہیں اور بہت بڑے شاعر ہیں۔ ان کا شمار دنیا کے عظیم شعراء میں ہوتا ہے۔ لیکن جیسا کہ خود انہوں نے بار بار کہا ہے بنیادی طور پر وہ ایک ریفارمر یا پیغام گو شاعر ہیں۔ انہوں نے شاعری کو مقصود بالذات نہیں بنایا بلکہ مقصود بالعرض اسے اپنے پیغام کی اشاعت کا ذریعہ بنایا۔

۲- دوسری بات ذہن نشین کرنے کے لائق یہ ہے کہ ان کا پیغام سراسر قرآن سے ماخوذ ہے۔ انہوں نے ساری عمر قرآن ہی کی تبلیغ کی — اب ان دونوں دعووں کا ثبوت پیش کرتا ہوں :

① آشنائے من زمن بیگانہ رفت ❊ از خمستانم تہی پیمانہ رفت
من شکوہِ خسروی او را دہم ❊ تختِ کسریٰ زیرِ پائے او نہم
او حدیثِ دلبری خواہد زمن ❊ آب و رنگِ شاعری خواہد زمن
(گلشنِ راز)

نہ بینی خیر ازاں مرد فرو دست ❊ کہ بر من تہمتِ شعر و سخن بست
بجبریل امیں ہم داستانم ❊ رقیب و قاصد و دربانے ندارم
دمے در خویشتن خلوت گزیدم ❊ جہانے لازوالے آفریدم

② دوسرے دعوے کا ثبوت (مسافر)

گوہرِ دریائے قرآں سفتہ ام ❊ شرحِ رمزِ "صبغۃ اللہ" گفتہ ام
دارم اندر سینہ نورِ لا الٰہ ❊ در شرابِ من سرورِ لا الٰہ
پس بگیر از بادۂ من یک دو جام ❊ تا درخشی مثلِ تیغِ بے نیام

اقبال کو قوم سے ہمیشہ یہی شکایت رہی کہ قوم نے مجھے شاعر سمجھا اس لئے

میرے پیغام کی طرف توجہ نہیں کی۔ افسوس کہ ابھی تک نہیں کی ؎

بآں رازے کہ گفتم پے نبردند ؛ ز شاخِ نخلِ من خرما نخوردند
من اے میرِ امم داد از تو خواہم ؛ مرا یاراں غزلخوانے شمردند

میں زندگی کا پیغام دے رہا ہوں لیکن مسلمان مجھ سے لوگوں کی تاریخ و وفات کا مطالبہ کر رہے ہیں!

تو گفتی از حیاتِ جاوداں گوے ؛ بگوشِ مردۂ پیغام جاں گوے
وے گو بندایں حق ناشناساں ؛ کہ تاریخ و وفاتِ ایں و آں گوے

یعنی اقبال کو مرتے دم تک قوم سے یہ شکایت رہی کہ اس نے میرے کلام کو سمجھا نہ پیغام کو۔ اس پر عمل کرنا تو خارج از بحث ہے۔ یہ دونوں رباعیات وفات سے چند ماہ پہلے کی ہیں۔

در بود و نبود من اندیشہ گمانہا داشت ؛ از عشق ھویدا شد ایں نکتہ کہ ہستم من

اقبال فہمی کے لئے ——— فارسی دانی اور علمی مذاق شرط ہے۔ لیکن قوم کا مذاق اب علمی نہیں بلکہ قلمی ہے اور فارسی کا مطلب ہے تضیعِ اوقات!

(۳) اب تیسرا نکتہ، ان کا کارنامہ کیا ہے ؎

چو رومی در حرم دادم اذاں من ؛ ازو آموختم اسرارِ جاں من!
بہ دورِ فتنۂ عصرِ کہن او ؛ بہ دورِ فتنۂ عصرِ رواں من

(۴) چوتھا نکتہ: فتنۂ عصرِ رواں کیا ہے؟ (تاکہ اقبال کا مقام واضح ہو سکے!) عقلِ انسانی، معیارِ حق و باطل ہے۔ جسے عقلِ انسانی حق قرار دے وہ حق ہے ورنہ باطل ہے۔ جدید فلسفے کی مختلف صورتیں ہیں:

POSITIVISM, EMPRIEISM, NATURALISM, LOGICAL POSITIVISM, PHENOMANONA-ISM, AGNOSFIEISM, SCEPFICISM, EXIST-ANTIALISM, MARXISM. DIALEC. MATERIAL-ISM

SECULARISM AND HUMANISM. etc.
لیکن وہ اپنی روح کے اعتبار سے خدا، نفسِ ناطقہ اور آخرت تینوں کے خلاف ہے یا لاادری ہے یا بے تعلق ہے یا ان کو لغو سمجھتا ہے۔ جدید فلسفہ اور جدید سائنس دونوں دین کے خلاف ہیں ؎

یورپ از شمشیرِ خود بسمل فتاد ٭ زیرِ گردوں رسمِ لادینی نہاد

⑤ اقبال کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اس زہر کا وہی تریاق مہیا کیا ہے جو رومی نے اپنے زمانے میں کیا تھا۔

⑥ وہ تریاق کیا ہے؟ عشق — یعنی عقل کے بجائے عشق کو اپنا رہنما بناؤ —!

⑦ اس کے لئے شانِ فقر پیدا کرنی لازمی ہے۔ کیونکہ عشق صرف شانِ فقر پیدا کرنے سے حاصل ہوسکتا ہے۔ اسی کو اقبال علمِ قلندری یا لنشۂ درویشی یا ایمانِ کامل سے تعبیر کرتے ہیں۔

⑧ پیغامِ اقبال: اپنے اندر شانِ فقر پیدا کرو، یہ فقر ہے کیا؟ ؎

جز بقرآں ضیغمی روباہی است ٭ فقرِ قرآں اصلِ شاہنشاہی است
فقرِ قرآں؟ اختلاطِ ذکر و فکر ٭ فکر را کامل ندیدم جز بہ ذکر

ذکر اور فکر دونوں قرآن کی اصطلاحیں ہیں۔ اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّھَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ۝ اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِھِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلًا ۚ — آپ نے دیکھا، غور کیا! اقبال کا پیغام قرآن سے ماخوذ ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ میں یہی شانِ فقر پیدا کردی تھی۔ صدیقِ اکبرؓ اور فاروقِ اعظمؓ اس کی نمایاں اور مشہور ترین تاریخی مثالیں ہیں۔ مملکت کا رقبہ ۲۲ لاکھ مربع میل، لیکن قمیص پر پیوند لگے ہوئے ہیں اور بیوہ عورتوں کا سودا سلف بازار سے خرید کر لا رہے ہیں، بس یہی ہے شانِ فقر۔ خودی عشق سے مستحکم ہوتی ہے اور عشق سے عشقِ رسولؐ مراد ہے ؎

کیمیا پیدا کن از مشتِ گلے ٭ بوسہ زن بر آستانِ کاملے

درِ دلِ مسلم مقامِ مصطفیٰؐ است ؛ آبروئے ما ز نامِ مصطفیٰؐ است
در شبستانِ حرا خلوت گزید ؛ قوم و آئین و حکومت آفرید
از کلیدِ دیں درِ دنیا کشاد ؛ ہمچو او بطنِ اُمّ گیتی نزاد
(اسرار ص ۱۹)

⑨ شانِ فقر پیدا کرنے کا قرآنی پروگرام بیان کرنے سے پہلے ایک اہم نکتہ اور واضح کر دوں۔ غالباً اقبال کی وفات سے سال بھر پہلے میں نے ان سے پوچھا تھا کہ آپ کے فلسفۂ خودی کا قرآنی ماخذ کیا ہے۔ یعنی یہ فلسفہ کونسی آیت سے ماخوذ ہے؟ انہوں نے جواب دیا سورۂ مائدہ کی اس مشہور اور اہم آیت سے : یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ ج (اے مسلماناں! محافظت کنید خویشتن را!) تم پر اپنی خودی کی حفاظت فرض ہے۔ یعنی دیکھتے رہو یا نگرانی کرتے رہو کہ وہ ضعیف نہ ہو جائے :

guard your souls — Take care of yours.

⑩ اب میں شانِ فقر پیدا کرنے کا قرآنی یا اقبالی پروگرام درج کرتا ہوں
کیفیت ہا خیزد از صہبائے عشق ؛ ہست ہم تقلید از اسمائے عشق!
عاشقی؟ محکم شو از تقلیدِ یار ؛ تا کمندِ تو کند یزداں شکار
اندکے اندر حرائے دل نشیں [۱] ؛ ترکِ خود کن [۲]، سوئے حق ہجرت گزیں [۳]
محکم از حق شو [۴]، سوئے خود گام زن [۵] ؛ لات و عزائے ہوس را سر شکن [۶]
لشکرے پیدا کن از سلطانِ عشق [۷] ؛ جلوہ گر شو بر سرِ فارانِ عشق [۸]
تا خدائے کعبہ بنوازد ترا
شرح انّی جاعلٌ سازد ترا

حرفِ آخر | یہ استحکامِ خودی کا — 8 Fold program ہے۔
اسی پروگرام کا خلاصہ "زبورِ عجم" میں بیان کر دیا ہے جسے 4 Fold پروگرام کہہ سکتے ہیں اسے

سلطان بمعنی غلبہ یا قوت۔

با نشۂ درویشی در ساز[۱] و مادم زن[۲] ÷ چوں پختہ شوی[۳]، خود را بر سلطنتِ جم زن[۴]
یعنی جب تمہاری خودی عشقِ رسولؐ کی بدولت مستحکم (پختہ) ہو جائے تو اللہ کا
نام لے کر ملوکیت اور قیصریت کے خلاف اعلانِ جنگ کر دو یا بالفاظِ دیگر
"باطل سے ٹکرا جاؤ!" — اور اللہ نے تمھیں قرآن میں مطلع کر دیا ہے کہ :-
: إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا ط — اور یہ بھی اطمینان دلا دیا ہے کہ :-
: وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ٥ — تقریر تو ختم ہو گئی،
اب مرثیہ سن لیجئے :

اللہ نے سورۂ مزمل میں تزکیۂ نفس یا استحکامِ خودی کا 8 fold
program - ہمیں عطا فرما دیا ہے اور یہ پانچویں وحی ہے :
(۱) قُمِ اللَّيْلَ إِلَّا قَلِيلًا (۲) وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا (۳)
وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ (۴) وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا (۵) فَاتَّخِذْهُ وَكِيلًا
(۶) وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ (۷) وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيلًا (۸) ذَرْنِي
وَالْمُكَذِّبِينَ وَمَهِّلْهُمْ قَلِيلًا ط

نوٹ:- بیسویں صدی میں ہندوؤں میں کئی ریفارمر پیدا ہوئے مثلاً (۱)
آروبندو گھوش (۱۹۵۰ء) (۲) رابندر ناتھ ٹیگور (۱۹۴۱ء) (۳)
شردھانند (۱۹۲۷ء) (۴) گاندھی (۱۹۴۸ء) (۵) تلک (۱۹۲۰ء)
(۶) گوکھلے (۱۹۱۵ء) (۷) لالہ ہنسراج (۸) پنڈت گورودت ودیارتھی
صاحب جی مہاراج + رادھا سوامی ست سنگ (آگرہ) (۹) مہادیو گووند
راناڈے (۱۰) — (۱۱) جی۔کے۔بی۔تلک[۱۲] - ہندوؤں نے ان سب مصلحین
کی تعلیمات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے آشرم اور تربیت گاہیں قائم کر دیں مثلاً
کانگڑی میں گروکل - شانتی نکیتن (بنگال)، دیال باغ (آگرہ) برہمو سماج
آشرم (لاہور) سابرمتی آشرم احمد آباد + ودیا پیٹھ احمد آباد — !!
National University, Ahmadabad.
Servants of Indian Society, Poona.
Bhandarkar Research Institute Poona.

Vedanta Ashrama, Pondicherry.
Dayal Bagh Agra.
گورودت بھون لاہور، ہنسراج ہال لاہور، بریڈ لا ہال لاہور، —
لاجپت رائے ہال لاہور —

لیکن مسلمانوں نے اقبال کی تعلیمات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے گذشتہ ۴۲ سال میں ایک ادارہ بھی قائم نہیں کیا جہاں پہلے کلامِ اقبال کو پڑھایا جائے پھر اسے سمجھایا اور سمجھایا جائے پھر اس پر عمل کرنے کا طریقہ بتایا جائے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہم مسلمانانِ پاکستان اقبال کو صرف ایک شاعر سمجھتے ہیں۔ اس لئے

آشنائے من ز من بیگانہ رفت ؎ از خمستانم تہی پیمانہ رفت

<u>خطاب بہ نژادِ نو</u> اقبال نے جاوید نامہ میں نوجوانوں سے خصوصیت کے ساتھ خطاب کیا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ نوجوانوں میں سے گذشتہ ۴۸ سال میں کسی نے بھی اسے نہیں پڑھا اور اگر کسی نے پڑھا بھی تو اس پر عمل نہیں کیا۔ میں یہاں اس طویل خطاب میں سے جو صـ۲۳۳ سے ۲۳۶ـہ تک پھیلا ہوا ہے — آخری نصیحت پیش کرنی چاہتا ہوں :-

رقصِ تن در گردش آرد خاک را ؎ رقصِ جاں برہم زند افلاک را
علم و حکم از رقصِ جاں آید بدست ؎ ہم زمیں ہم آسماں آید بدست
فرد از وے صاحبِ جذبِ کلیم ؎ ملّت از وے وارثِ ملکِ عظیم
رقصِ جاں آموختن کارے بود ؎ غیرِ حق را سوختن کارے بود
تا ز نارِ حرص و غم سوزد جگر ؎ جاں بہ رقص اندر نیاید اے پسر
اے مرا تسکینِ جانِ ناشکیب ؎ تو اگر از رقصِ جاں گیری نصیب

سرِّ دینِ مصطفےٰ ﷺ گویم ترا
ہم بقبر اندر دعا گویم ترا

اقبال کا پیغام یہ ہے کہ جسمانی کے بجائے روحانی رقص سیکھو یعنی اپنی روح کو رقص میں لاؤ کہ یہی سرِّ دینِ مصطفےٰ ہے۔ لیکن مسلمانوں نے آج تک کوئی

بقیہ صـ۴۷

سائنس بطور تصوّف = اقبال کا اجتہاد

مظفر حسین

تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ کے دیباچے میں علامہ اقبال مذہبی واردات کے لئے ایک ایسے نئے منہاج کے متلاشی نظر آتے ہیں جو زیادہ بدنی ریاضت کا طالب نہ ہو اور نفسیاتی اعتبار سے اس ذہن کے قریب تر ہو جو محسوسات کا خوگر ہے۔ ان کے نزدیک دورِ حاضر میں قرونِ وسطیٰ کے تصوّف کی تکنیک بیکار ہو کر رہ گئی ہے۔ چنانچہ وہ بڑے زوردار الفاظ میں فرماتے ہیں کہ اسلام قرونِ وسطیٰ کے تصوّف کی تجدید کو روا نہ رکھے گا جس نے اس کے پیروؤں کے صحیح رجحانات کو کچل کر اس کا رُخ ایک مبہم تفکّر کی طرف پھیر دیا تھا اور جو انہیں یہ تعلیم دیتا تھا کہ ٹھوس حقائق کی دنیا کی طرف سے آنکھیں بند کر کے اپنی نگاہوں کو اُن سرخ، نیلے، پیلے لطائف و تجلّیات پر مرکوز کر دیا جائے جو دماغ کے خلیوں کے اندرونی ہیجان سے پیدا ہوتے ہیں اور جن کی خارج کی دنیا میں قطعاً کوئی حقیقت ہی نہیں ہوتی۔ تصوّف کی اس قسم میں حقیقت کی تلاش ایسے کونوں اور کھُدروں میں کی جاتی ہے جہاں اس کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں پایا جاتا۔ ایسے تصوّف کو وہ مسلمانوں کے دورِ انحطاط کی علامت سمجھتے ہیں جس نے مسلمانوں کے بہترین دماغوں کو اپنے اندر جذب کر کے اُمورِ سلطنت کو معمولی ذہنی صلاحیت رکھنے والے لوگوں کے حوالے کر دیا جس کے نتیجے میں ان سے دُنیا کی امامت چھن گئی۔ چنانچہ علامہ اقبال پوری تحدّی سے فرماتے ہیں:

"جدید اسلام اس تجربہ کو نہیں دُہرا سکتا کیونکہ وہ جدید تفکّر اور تجربہ کی روشنی میں قدم رکھ چکا ہے اور اب کوئی ولی اور پیغمبر بھی اس کو قرونِ وسطیٰ کے تصوّف کی تاریکیوں کی طرف نہیں لے جا سکتا۔!"

۲- جدید تفکر اور تجربہ سے علامہ اقبال کی مراد سائنس کا حسی اور تجرباتی طریق تحقیق ہے جس نے دورِ حاضر کے انسان کو فکرِ محسوس کا عادی بنا دیا ہے۔ علامہ اقبال کے خیال میں یہ وہ طرزِ فکر ہے جس کی اسلام نے اپنے تہذیبی نشوونما کے ابتدائی ادوار میں حمایت کی۔ قرآن حکیم کی تعلیمات کے مطابق فطرت کے وہ تمام مظاہر جو انسان کے حواس کے سامنے جلوہ گر ہیں درحقیقت اللہ تعالیٰ کے انوار و تجلیات ہیں جن کا مطالعہ و مشاہدہ خدا کی معرفت حاصل کرنے کے لئے ناگزیر ہے۔

کوہ و صحرا، دشت و دریا، بحر و بر ❊ تختۂ تعلیم اربابِ نظر!

ہر چہ می بینی ز انوارِ حق است ❊ حکمتِ اشیاء ز اسرارِ حق است
ہر کہ آیاتِ خدا بیند حُر است ❊ اصلِ ایں حکمت ز حکمِ اُنظر است

چنانچہ مسلمان کا یہ فرض ہے کہ وہ مظاہرِ قدرت میں اللہ تعالیٰ کے ان نشانات پر غور و فکر کرے اور ان پر سے اس طرح نہ گزر جائے کہ گویا وہ ایک اندھا اور بہرہ شخص ہے۔ قرآن حکیم کا فرمان ہے کہ جو شخص اس دُنیا میں ان چیزوں کو نہیں دیکھتا وہ اگلی دنیا کے حقائق سے بھی بے بہرہ رہے گا۔ قدرت کا علم درحقیقت خدا کے کردار کا علم ہے۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ ہمارے پاس خدا کو جاننے کا اوّلین ذریعہ حواسِ خمسہ ہی ہیں۔ خدا کی ہستی اور اس کی صفات مظاہرِ فطرت میں آشکار ہیں اور چونکہ خدا اس محسوس کائنات سے جُدا اور الگ تھلگ نہیں ہے، اس لئے اس محسوس کائنات کا علم ہی خدا کا علم ہے ؎

علمِ حق اوّل حواس آخر حضور ❊ آخرِ او می نہ گنجد در شعور

چنانچہ جب ہم قدرت کا مشاہدہ کرتے ہیں تو بقولِ اقبال خودیٔ مطلق یعنی خدا سے ہی ایک طرح کی واقفیت پیدا کر رہے ہوتے ہیں جو کہ عبادت ہی کی ایک شکل ہے۔

یہ سب ہیں ایک ہی سالک کی جستجو کے مقام ❊ وہ جس کی شان میں آیا ہے علم الاسماء
مقامِ ذکر کمالاتِ رومی و عطار ❊ مقامِ فکر مقالاتِ بوعلی سینا
مقامِ فکر پیمائشِ زمان و مکاں ❊ مقامِ ذکر سُبحان ربی الاعلیٰ

علامہ اقبال کا یہ خیال ہے کہ عبادت اور دعا درحقیقت مطالعۂ فطرت کی سائنسی سرگرمیوں کا لازمی تکملہ ہیں اور حقیقتِ مطلقہ کے بارے میں مزید گہری بصیرت کے لئے ہمارے اندرونی ادراک کو تیز تر کر دیتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ فطرت کا مطالعہ (یعنی سائنسی علوم)

اور فطرت پر ہماری گرفت اور دسترس ہی بالآخر ہمیں اس مقام تک پہنچاتی ہے جہاں ہم حقیقتِ مطلقہ کا مشاہدہ کرنے کے قابل بنتے ہیں۔ حقیقتِ مطلقہ کے مشاہدہ کی خواہش ہر انسان کے دل میں رکھی گئی ہے۔ تصوّف اور سلوک و طریقت کی طرف انسان کا میلان اور جھکاؤ اسی خواہش کا نتیجہ ہے۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں :

"ہر انسان کے دل میں ایک ہوس ہے، ہر شخص کی یہ خواہش ہے کہ اسے نظامِ عالم کی حقیقت معلوم ہو جائے۔ یہود کا سوال کہ ہم خدا پہ اس وقت تک ایمان نہ لائیں گے جب تک اسے عیاناً نہ دیکھ لیں اسی خواہش کا نتیجہ تھا کہ خود موسیٰ کلیم اللہ نے بھی "ربّ ارنی" کی درخواست کی تھی، غرض مشاہدہ کی ہوس عالم گیر ہے، مَیں نے اس خیال کو دو اشعار میں سمجھایا ہے :

خرد گفت او بچشم اندر نہ گنجد ❊ نگاہِ شوق در اُمّید و بیم است!
نہ می گردد کہن افسانۂ طور ❊ کہ در ہر دل تمنّائے کلیم است!

موسیٰ علیہ السّلام کی کہانی پرانی نہیں، آج بھی ہر شخص "ربِّ ارنی" کہہ رہا ہے۔ حقیقت کا مشاہدہ دو طرح سے ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ نے فرمایا : وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ (۱۶ : ۳۰) اس آیت میں حصولِ علم کے ذریعوں کی طرف اشارہ ہے۔ ایک ذریعہ تو سمع و بصر ہے، دوسرا ذریعہ انسان کا قلب ہے۔ یعنی یہ نہ ہو کہ سمع و بصر کو چھوڑ کر کلّی طور پر قلب کی طرف متوجّہ ہو اور ایسا بھی نہ ہو کہ قلب سے غافل ہو کر بالکل سمع و بصر کے ہو رہو۔ مسلمانوں نے اپنی توجّہات قلب پر مرتکز کر دیں اور سمع و بصر سے پورا کام نہ لیا بلکہ ساری ایشیائی تہذیب کا یہی خاصہ ہے!"

آگے چل کر اسی حقیقت کی وضاحت کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں :

"نظامِ عالم کی آفرینش یوں ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنی نمو کے لئے یا اپنے آپ کو ظاہر اور نمایاں کرنے کے لئے دُنیا کو پیدا کیا۔ اس خط سفر کا آخری نقطہ عالم ظاہر ہے۔ اب حقیقت تک پہنچنے کی راہ یہ ہے کہ اس آخری نقطہ سے الٹا سفر کیا جائے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ مظاہر کو چھوڑ کر حقیقت کی طرف متوجّہ ہوں۔ اس کا مقصد یہ نہ ہونا چاہیئے کہ انسان مشاہدۂ حقیقت کے ساتھ اپنے آپ کو فنا کر دے۔ اسلام کا عندیہ یہ ہے کہ حقیقت کا مشاہدہ مردانہ وار کیا جائے۔ ایک شاعر نے اس حقیقت پر اس شعر میں روشنی ڈالی ہے

موسیٰ زہوش رفت بیک جلوۂ صفات ؛ تو عینِ ذات می نگری و در تبسمے

چنانچہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مبارک رویہ اس سلسلے میں یہ رہا کہ بہ بنائے وحی علم کی انتہائی بلندیوں پر فائز ہونے کے باوجود یہی دعا فرماتے رہے کہ اے میرے ربّ! میرے علم میں اضافہ کر اور اے میرے ربّ! مجھے اشیاء کی اصل حقیقت سے آگاہ کر جیسی کہ فی الواقع وہ ہیں:

سیّدِ کل، صاحبِ اُمّ الکتاب ؛ پردگی ہا بر ضمیرش بے حجاب

گرچہ عینِ ذات را بے پردہ دید ؛ ربِّ زدنی از زبانِ او چکید

علّامہ اقبال بار بار اس حقیقت کی طرف متوجّہ کرتے ہیں کہ فکر و وجدان ایک دوسرے کی ضد نہیں، دونوں کا سرچشمہ ایک ہی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کا سبب بنتے ہیں۔ ایک جزوًا جزوًا حقیقتِ مطلقہ پر دسترس حاصل کرتا ہے اور دوسرا من حیث الکل۔ وجدان بھی درحقیقت فکر ہی کی ترقی یافتہ شکل کا دوسرا نام ہے۔ دونوں کی منزل ایک ہے یعنی حقیقت مطلقہ تک رسائی ؎

ہر دو بمنزلے رواں ہر دو امیرِ کارواں ؛ عقل بحیلہ می بُرد عشق بُرد کشاں کشاں!

چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ معرفت کو علم پر ترجیح دینا مذہبی اعتبار سے ہر قسم کی رہبانیت کی جڑ ہے اور علمی اعتبار سے ان تمام علومِ حسّیہ و عقلیہ کی ناسخ ہے جن کی وساطت سے انسان نظامِ عالم کے قوتوں کو مسخّر کر کے اس زمان و مکان کی دُنیا پر حکومت کرنا سیکھتا ہے۔ یہی امتیازِ عیسوی رہبانیت کی جڑ ہے جس کی نسبت خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں فرمایا:۔

رَهْبَانِيَّةَ نِ ابْتَدَعُوْهَا: "رہبانیت جس کو انہوں (عیسائیوں) نے ایجاد کیا!"

علّامہ اقبال نے سائنسی علوم کو معرفتِ الٰہی کا وسیلہ قرار دینے میں بہت زور کلام صرف کیا ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے کہیں تو تصوّف کے ان مسلّمات کو ہدفِ تنقید بنایا ہے جن کی رُو سے علم کو معرفتِ الٰہیہ میں رکاوٹ سمجھا جاتا ہے۔ کہیں علم و عرفان اور عقل و وجدان کو اصلاً ایک ہی قرار دیا ہے اور کہیں علم کو عرفان پر فوقیت دی ہے اور اس ضمن میں مختلف صوفیائے کرام کی نگارشات سے حوالے بھی دیئے ہیں۔ مثلاً اپنے مضمون "علمِ ظاہر اور علمِ باطن!" میں انہوں نے "کتاب المیثاق" میں سے حضرت جنید بغدادی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:

"علم معرفت سے بلند تر، کامل تر اور جامع تر ہے اور اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ علم منسوب

کیا جاتا ہے نہ کہ معرفت؟ اسی طرح خطبات میں انہوں نے مولانا رومؒ کے مندرجہ ذیل زوردار اشعار نقل کئے ہیں :

دفترِ صوفی سواد و حرف نیست ❊ جز دلِ اسپید مثل برف نیست
زادِ دانشمند آثارِ قلم ❊ زادِ صوفی چیست؟ آثارِ قدم
ہمچو صیّاد سے سوئے آشکار شد ❊ گامِ آہو دید و بر آثار شد
چند گامش گامِ آہو در خور است ❊ بعد ازاں خود نافِ آہو رہبر است
راہ رفتن یک نفس بر بوئے ناف ❊ بہتر از صد منزل و گام و طواف

ان اشعار کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں :

"علم کی جستجو جس رنگ میں بھی کی جائے عبادت ہی کی ایک شکل ہے اس لئے فطرت کا علمی (سائنٹفک) مشاہدہ بھی کچھ ویسا ہی عمل ہے جیسے حقیقت کی تلاش میں صوفی کا سلوک و عرفان کی منزلوں کو طے کرنا کہا جا سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بحالتِ موجودہ اس کی نگاہیں گامِ آہو پر ہیں، اس لئے اس کا جادۂ طلب بھی محدود ہے لیکن اسکی تشنگیٔ علم اسے بہت جلد اس مقام پر لے جائے گی جہاں گامِ آہو کی بجائے نافۂ آہو (کی خوشبو) اس کی رہبری کرے گی۔ عالمِ فطرت پر یوں ہی اسے مزید غلبہ حاصل ہوگا اور یوں ہی اسے وہ بصیرت ملے گی جس کی فلسفہ کو آرزو تو ہے لیکن جس کا حصول اس کے لئے ناممکن ہے!"

علامہ اقبال کے یہ خیالات نئے نہیں ہیں، امام غزالی اپنی کتاب "الحکمتہ فی مخلوقات اللہ" کے مقدمہ میں لکھتے ہیں :

"برادر! خدا تجھے حقیقت شناسی کی توفیق عطا کرے اور دین و دنیا کی فلاح و کامرانی نصیب فرمائے۔ خدا کی معرفت اس کے عجائبات و مصنوعات میں تدبّر و تفکّر کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی اور درحقیقت یہی معرفت ایمان و یقین کے ثبات و استحکام کا موجب ہے اور اسی سے ابرار و اتقیاء کے منازل و مدارج میں تفاوت ہوتا ہے۔ چونکہ حقیقی معرفت کا حصول مخلوقاتِ الٰہی میں غور و فکر کرنے پر منحصر تھا۔ اس لئے اس کتاب کو ارباب قول کی رہنمائی کے لئے لکھا گیا ہے۔ اس میں وہ مصلحتیں اور حکمتیں بیان کی گئی ہیں جن کی طرف قرآن حکیم کے متعدد مقامات پر اشارات موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقلِ سلیم عطا کی اور وحی کے ذریعے اس کی رہنمائی فرمائی اور اصحابِ نظر اور اربابِ عقول کو اپنی مصنوعات میں غور و فکر کی اپنی اپنی

استعداد کے مطابق دعوت دی!"

غور سے دیکھا جائے تو امام غزالی کے یہ خیالات علامہ اقبال کے خیالات سے ذرا بھی مختلف نہیں ہیں۔ دورِ حاضر میں علامہ اقبال کے بعد ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم اس نقطۂ نظر کے سب سے بڑے حامی اور مؤید تھے، جنھوں نے اپنی زندگی کا آخری حصہ اسی مقصد کے لئے وقف کر رکھا تھا کہ سائنسی علوم کو اسلام کے عقیدۂ توحید سے مربوط کر کے سائنس کو خدا جوئی، خدا شناسی اور خدا یابی کا سب سے بڑا ذریعہ بنا دیا جائے اور اس سے وہی کام لیا جائے جو ایک زمانے میں اسلام کی روح کی حفاظت کرنے کے لئے تصوّف سے لیا گیا تھا۔ شارحِ اقبال کی حیثیت سے ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم نے خود اپنی طرف سے بھی بڑے خوبصورت نکتے پیدا کئے ہیں۔ چنانچہ "حکمتِ اقبال" میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"مسلمانوں کے نزدیک خدا کا تصوّر ہستیٔ غائب نہیں اور نہ ہی وہ کوئی ورائے علم ہستی ہے، بلکہ وہ وہی ہستی ہے جس کی شہادت خود علومِ جدیدہ یعنی سائنسی علوم ہمیں پہنچا رہے ہیں۔ یہ بات کہ خدا کی ذات ہماری آنکھوں سے مخفی ہے اس صداقت میں ذرّہ برابر فرق نہیں پیدا کرتی کہ خدا عین ہمارے سامنے موجود ہے۔ چنانچہ جس طرح ہم اپنے کسی دوست کی شخصیت (یا خودی) کو اس کے آثار و نتائج سے جو اس کے اعمال و افعال کی صورت اختیار کرتے ہیں اچھی طرح جان لیتے ہیں حالانکہ اس کی شخصیت یا خودی ہمیں نظر نہیں آتی، بالکل اسی طرح مظاہرِ فطرت میں خدا کی صفات کی بھرپور آشکارائی کے باوجود اس کی ذات ہماری نظروں سے مخفی رہتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ چند مظاہرِ فطرت کے بیان کے متصلاً بعد قرآن کا ارشاد ہوتا ہے: ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ۝ (یہ ہے اللہ تمھارا پروردگار، پھر تم کدھر بھٹکتے پھر رہے ہو!)۔ ذٰلِكُمْ کا اشارہ صرف ایسی ہستی کی طرف کیا جا سکتا ہے جو صاف سامنے نظر آ رہی ہو!"

اس سے ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ جس طرح فلسفۂ مغرب میں نامشہود (UN SEEN) اور فوق الفطرت (SUPERNATURAL) کے الفاظ خدا کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں، اسلام میں استعمال نہیں کئے جا سکتے۔

علامہ اقبال کے نزدیک یہ عالم اصلاً روحانی عالم ہے اور ان کے نزدیک عالمِ اسلام کو آج جن تین چیزوں کی ضرورت ہے اس میں اوّلین اور سرِفہرست ضرورت اس بات

کی ہے کہ کائنات کی روحانی تعبیر کی جائے اور وہ صرف اسی طرح ممکن ہے کہ روحانیت کا چشمہ خود سائنس کے بطن سے پھوٹے۔ علّامہ اقبال کا خیال ہے کہ سائنس کے نو بہ نو انکشافات کے ساتھ ساتھ مذہب اور سائنس میں ایسی ایسی ہم آہنگیوں کا انکشاف ہوتا رہے گا جو سرِ دست ہماری نظروں سے اوجھل ہیں۔ جوں جوں علم میں ہمارا قدم آگے بڑھے گا فکر کے نئے راستے کھلیں گے :

(سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ)

جہاں میں دانش و بینش کی ہے کس درجہ ارزانی ⁂ کوئی شے چھپ نہیں سکتی کہ یہ عالم ہے نورانی!
کوئی دیکھے تو ہے باریک فطرت کا حجاب اتنا ⁂ نمایاں ہیں فرشتوں کے تبسّم ہائے پنہانی!
یہ دنیا دعوتِ دیدار ہے فرزندِ آدم کو ⁂ کہ ہر مستور کو بخشا گیا ہے ذوقِ عریانی!

اس ضمن میں علّامہ اقبال کا اپنا تجربہ یہ ہے کہ رسم و رہِ فرزانگی نے انہیں روحانیت کی دہلیز پہ لا کھڑا کیا ہے ؎

گہے رسم و رہِ فرزانگی ذوقِ جنوں بخشد ⁂ من از درسِ خردمنداں گریباں چاک می آیم

اور علّامہ اقبال نے اپنی حد تک اپنے اس تجربے کو دوسروں تک منتقل کرنے کی کوشش بھی کی ہے جس کا اعلان "پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق؟" کے سرِ آغاز "بخوانندۂ کتاب" میں ان پُر زور الفاظ میں ملتا ہے :

سپاہِ تازہ برانگیزم از ولایتِ عشق ⁂ کہ در حرم خطرے از بغاوتِ خرد است
زمانہ ہیچ نہ داند حقیقتِ او را ⁂ جنوں قباست کہ موزوں بقامتِ خرد است
بآں مقام رسیدم چو در برش کردم ⁂ طوافِ بام و درِ من سعادتِ خرد است
گماں مبر کہ خرد را حساب و میزاں نیست ⁂ نگاہِ بندۂ مومن قیامتِ خرد است

علّامہ اقبال کا یہ پختہ عقیدہ ہے کہ سائنس کا رشتہ اگر مذہب کے ساتھ جوڑ دیا جائے تو اس سے ایک ایسی نئی تہذیب جنم لے گی جس کی آج کی دُکھی انسانیت کو تلاش ہے۔

"جاوید نامہ" میں وہ سعد حلیم پاشا کی زبان سے کہلواتے ہیں :

غربیاں را زیرکی سازِ حیات ⁂ شرقیاں را عشق رمزِ کائنات
زیرکی از عشق گردد حق شناس ⁂ کارِ عشق از زیرکی محکم اساس
عشق چوں با زیرکی ہمسر بود ⁂ نقش بندِ عالمِ دیگر شود!

خیز و نقشِ عالمِ دیگر بنہ ؞ عشق را با زیرکی آمیز دہ

ایک دوسری نظم میں وہ عقل اور عشق (یعنی سائنس اور مذہب) کی باہمی گفتگو کے پیرائے میں اس بات کو واضح کرتے ہیں کہ موجودہ دَور کے آلام و مصائب کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ سائنس کا بنیادی مقصد معرفتِ خداوندی تھا لیکن جب سے سائنس کا رشتہ مذہب سے منقطع ہوا ہے دُنیا ایک عذاب کی جگہ بن گئی ہے :

ز افسونِ تو دریا شعلہ زار است ؞ ہوا آتش گداز و زہر دار است

چو با من یار بودی، نُور بودی ؞ بُریدی از من و نورِ تو نار است

بخلوت خانۂ لاہوت زادی

و لیکن در نخِ شیطاں فتادی

علامہ اقبال کی ان تصریحات کے پیشِ نظر یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ علاّمہ اقبال کو مذہبی واردات کے جس نئے منہاج کی تلاش ہے وہ ان کے خیال کے مطابق سائنس میں اسلامی توحید کا عقیدہ شامل کرنے سے معرضِ وجود میں آئے گا۔ اس طرح سے تصوّف میں ایک نیا سلسلۂ سلوک پیدا ہو گا جو ہمیں اسلام کی اصل پاکیزگی کی طرف لوٹائے گا۔

(بقیہ صـ ۳۹)

ایسی تربیت گاہ قائم نہیں کی جس میں روح کو رقص کرنا سکھایا جا سکے۔

حقیقتِ حال یہ ہے کہ اقبالؔ کا نصف کلام مسلمانوں کی عدم توجّہ یا عدم اعتنا کی وجہ سے OBSOLETE یعنی منسوخ اور متروک ہو چکا ہے مثلاً

نغمۂ خاموش دارد سازِ وقت ؞ غوطہ در دل زن کہ بینی رازِ وقت

مدّاحین و عاشقانِ اقبالؔ میں سے کتنوں نے غوطہ لگایا ہے؟ ؎

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی ؞ تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن

کتنے عاشقانِ اقبال آج تک اپنے من میں ڈوبے ہیں؟ اس قسم کے اشعار سینکڑوں سے متجاوز ہیں۔ سچّی بات یہ ہے کہ اقبالؔ کا کلام ایک پیغام ہے اور پیغام پر عمل کرنا لازمی ہے۔ صرف اس کی داد یا تحسین ایک فعل عبث ہے۔ مثلاً طبیب کا نسخہ اگر مریض اسے استعمال کرنے کے بجائے صرف زبان سے اس کی تحسین کرتا رہے گا تو اس کے [illegible]ن کا کبھی ازالہ نہیں ہو سکے گا۔

(بقیہ صاا)

درانی نے تقریریں اور صاحب صدر کے مقالہ پر یہ اجلاس اختتام پذیر ہوا پانچواں اجلاس " قومی و ملی مسائل اور قرآن حکیم " کے موضوع کو اپنے جلو میں لئے ہوئے تھا صدر اجلاس تھے جناب ڈاکٹر سلیم فارانی اور مقررین و مقالہ نگار حضرات جناب عبدالروف، خواجہ غلام صادق پروفیسر بختیار حسین، پروفیسر عبدالمنان جناب اختر الواسع -

چھٹے اجلاس کا موضوع " فلسفہ اور سائنس کے مسائل اور قرآن حکیم " تھا صدارت پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب خیرات محمد ابن رسا نے کرنا تھی مگر اسلام آباد میں اپنی مصروفیات کے سبب وہ نہ آ سکے تو جناب پروفیسر بشیر احمد صدیقی نے صدارت کی کرسی سنبھالی۔ جناب خلیق احمد (ایڈیٹر " یقین " انٹرنیشنل، ڈاکٹر ابصار احمد، ڈاکٹر ابوبکر، پروفیسر یوسف سلیم چشتی اور صاحب صدر نے خطاب کیا -

ساتواں اور آٹھواں اجلاس قرآن اکیڈمی میں منعقد ہوا جہاں جناب عبدالغفار شکیل (علی گڑھ یونیورسٹی) مظفر حسین۔ جناب حافظ احمد یار، ڈاکٹر الطاف جاوید، پروفیسر مرزا محمد منور، پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے مقالات پڑھے اور تقریریں کیں - اسی شام سماع مسنون یعنی حسن قرأت کی محفل بھی ہوئی۔ اس کانفرنس کے ایک اجلاس میں ملک کے ممتاز اور معروف صحافی م، ش نے اپنے ایک کالم میں بھرپور تبصرہ لیا جو نذر قارئین ہے -

" اِک بُلبُل ہے کہ ہے محوِ ترنم اب تک! "

تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند
اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی!

ایک دن میں نے حضرت علامہ اقبالؒ کا مندرجہ بالا شعر پڑھ کر ان سے پوچھا کہ آیا اس تین سو سالہ ریفرنس سے اُن کی مراد اورنگ زیب عالمگیرؒ کی شخصیت سے ہے تو انہوں نے فرمایا : " نہیں میری مراد اس سے مجددِ الفِ ثانی سے ہے! "

(بقیہ ص۳۹)

OUR ENGLISH LITERATURE

by

DR. ISRAR AHMAD

1 The Obligations Muslims owe to the Quran.

2 The Way to Salvation in the Light of Surah Al-'Asr.

3 Islamic Renaissance—The Real Task Ahead.

4 Quran and World Peace.

Under Preparation

5 Two Periods of Rise and Decline of the Muslim Ummah.

6 Our Obligations to the Holy Prophet (p b.u h)

7 The Purpose Behind Mohammad's (p.b.u.h) Prophethood.

——:o:——

ضروری اعلان

(۱) ماہنامہ "میثاق" کے ہندوستانی خریداروں سے گذارش ہے کہ وہ سالانہ زر تعاون مبلغ دس روپے حسب ذیل پتہ پر ارسال کر کے منی آرڈر کی رسید ہمیں پاکستان بھیج دیں - پرچہ جاری کر دیا جائے گا ۔
ماہنامہ "الرسالہ" جمعیت بلڈنگ ، قاسم جان اسٹریٹ - دہلی

(۲) مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی مطبوعات کے لئے بھی رقم مندرجہ بالا پتہ پر ارسال کر کے منی آرڈر کی رسید ہمیں بھیجی جاسکتی ہے -

(۳) مولانا وحید الدین خان صاحب کا ماہنامہ "الرسالہ" دہلی اور ان کی مطبوعات کے پاکستانی خریدار ہم سے رابطہ قائم فرمائیں ۔

مینجر ماہنامہ "میثاق"

Regd. L. No. 7360

Monthly **MEESAQ** Lahore

Vol. 29 | September - October 1980 | No. 9-10

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان —— اور —— سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے علم و حکمت کی

وسیع پیمانے —— اور —— اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ اُمّتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں **تجدیدِ ایمان** کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے

اور اس طرح

اِسلام کی نشأۃِ ثانیہ — اور — غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ